دیارِ محدثین میں چند دن

(سفرِ بخارا و سمرقند)

استاذِ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں سیاحتی وعلمی سفر کی سرگزشت

تقریظ

حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ محمد ثانی صاحب مدظلہ العالی

تحریر

محمد کامران اجمل

ادارہ تحقیقاتِ چشتیہ کراچی

دیار محدثین میں چند دن

(سفر بخارا و سمرقند)

تحریر
محمد کامران اجمل

ناشر
ادارہ تحقیقات چشتیہ

کتاب کا نام: **دیار محدثین میں چند دن**
(سفر بخارا و سمرقند)

تالیف: **محمد کامران اجمل**

تقریظ: حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ **محمد ثانی** صاحب حفظہ اللہ

طبع اول: ماہ جمادی الاُولیٰ: ۱۴۴۴ھ - بمطابق: نومبر ۲۰۲۲ء

صفحات: ۱۵۶

قیمت:

ناشر

ادارہ تحقیقات چشتیہ کراچی، پاکستان

فہرست مضامین کتاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى، أمّا بعد:

سیر و سیاحت اور سفر کو "وسیلہ ظفر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخ ساز حقیقت ہے کہ سفر انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے طبع انسانی کا لازمہ رہا ہے۔ کرّہ ارض پر بنی نوعِ آدم حضرتِ انسان کا وجود عالم بالا سے سفر ہی کے باعث ہے۔ سفر کی تاریخ انسانی تاریخ کی ہم عمر ہے۔ حضرتِ انسان ازمنہ قدیم ہی سے سفر کا خوگر رہا ہے۔ گویا سفر اور انسان لازم ملزوم ہیں۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے!

قدر مردم سفر پدید آرد
خانہ خویش مرد رابند ست
چوں بسنگ اندرون بود گوہر
کس نداند کہ قیمتش چند ست

مرد کی اصل قدر و قیمت سفر کے ذریعہ نمایاں ہوتی ہے، چوں کہ آدمی اپنے گھر میں ایک قیدی کی طرح ہے، جیسے گوہر پتھر کے اندر موجود ہوتا ہے، جب تک وہ اس پتھر سے باہر نہیں نکالا جاتا، اس

وقت تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اور جب یہ پتھر سے نکل کر سفر شروع کرتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر قیمتی متاع ہے۔

"سفر" ہجرت کا وسیلہ، انبیاء ورسل اور امام الانبیاء، سید المرسلین، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین عظام، تبع تابعین، فقہاء، محدثین ہر دور کے علماء، صوفیائے کرام، اولیائے عظام کا بھی یہی دستور رہا ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر محوِ سفر اور متحرک رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام دنیا کے چپے چپے اور شرق و غرب کے گوشے گوشے تک پھیل گیا۔ جس قدر اسفار اور علومِ نبوی ﷺ کی ترویج واشاعت میں بادیہ پیمائی حضراتِ محدثین نے کی، شاذونادر ہی کسی سیاح کے حصے میں آئی ہو۔

عالمِ اسلام، دنیا کے مختلف خطوں، شرق و غرب، غرض کرہ ارض پر آج جہاں اسلام اور مسلمان موجود ہیں، وہاں صدیوں سے اسلام کے مبلغین، داعیان دین مبین کے اسفار کی بدولت ہی توحید کا نور عام ہوا۔ اشاعتِ اسلام کی راہیں ہموار ہوئیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تابعین، تبع تابعین، فقہاء و محدثین، ہر دور کے علمائے دین نے سفر ہی کی بدولت دین کے ابلاغ، قرآن و سنت کی نشر واشاعت اور علوم دینیہ کے فروغ میں تاریخ ساز اور کلیدی کردار ادا کیا۔ اسلامی تاریخ، اسماء الرجال، محدثین اور فقہائے امت کے تذکروں پر مشتمل کتب کا اسلامی ذخیرہ، ان حضرات کے طویل اور کٹھن اسفار کے ذریعے ان کی عظیم علمی اور دینی خدمات پر گواہ ہے۔ اس سے متعلق معلومات دیارِ عرب اور عالمِ اسلام کے بلند پایہ عالم دین اور عظیم محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی بے مثال تالیف "صبر العلماء علیٰ شدائد العلم" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جبکہ علامہ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ

نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "سير أعلام النبلاء"، میں ایسے ان گنت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، فقہاء و محدثینؒ، اور اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار کے نابغہ عصر اور مشہور علماء کے تذکروں میں عالمِ اسلام کے ملکوں ملکوں، قریوں قریوں، کوچوں کوچوں میں ان حضرات کی بادیہ پیمائی اور مسلم دنیا کے دیار و امصار میں ان کے طویل اسفار، ماہ و سال پر مشتمل مسافرت کے نتیجہ میں ہر شعبہ علم میں ان کی قابل افتخار اور گراں قدر خدمات کا تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا ہے۔

طلبِ علم اور دعوتِ دین کے لیے مسافرت اور سفر اختیار کرنا اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک روشن و درخشاں باب ہے۔ بلاشبہ، سفر ہی وہ وسیلہ اور ذریعہ ہے، جس کی بدولت حقائق سے پردے اٹھتے اور خود شناسی کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ دورانِ سفر دقّتِ نظر، قوتِ مشاہدہ، اور تفکر و تدبر کو کام میں لاتے ہوئے اپنے مشاہدات کو قلم بند کرنا اور سفر کے مقامات، مشاہدات اور اس حوالے سے علمی اور تاریخی حقائق کو پیش کرنا، ایک "سفر نامہ" نگار کے وسیع تر مشاہدے اور غایت درجہ مطالعہ کا آئینہ دار تصور کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان ازمنہ قدیم ہی سے سفر کا خوگر رہا ہے، ایسے ہی سفر کے حالات وواقعات اور مشاہداتِ سفر قلم بند کرنے کا رواج بھی صدیوں پر محیط اور خاصا قدیم ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں لکھے گئے سفر نامے آج بھی نادر معلومات کا خزینہ، اس دور کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کا روشن آئینہ اور علم و معرفت کا سرچشمہ ہیں۔ مشرقی زبانوں بالخصوص عربی اور فارسی زبانوں میں "سفر نامہ" لکھنے کی روایت خاصی قدیم ہے۔ عربی زبان و

ادب میں ابن جُبیر کے سفر نامہ "رحلة ابن جُبیر" اور ابن بطوطہ کے سفر نامہ "تحفة النظار في غرائب الأمصار و عجائب الأسفار" کو سفر ناموں کی تاریخ میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔

محمد بن جبیر دنیا کے ان چند سیاحوں کی صف اول میں نظر آتے ہیں، جنہوں نے اپنی مسافرت میں ایک دنیا کو شامل کر لیا ہے۔ یہ سفر نامہ کم و بیش آٹھ سو سال قبل کا ہے۔ ابن جبیر کا تعلق غرناطہ (اندلس) سے تھا۔ یہ در اصل ان کا سفر نامہ حج ہے۔ جو انہوں نے ذی الحجہ ۵۷۸ھ میں شروع کیا اور صقلیہ، شام، مصر، فلسطین، عراق، لبنان، اور حجازِ مقدس کے مکمل احوال و آثار اور مشاہداتِ سفر کو سمیٹتے ہوئے محرم الحرام ۵۸۱ھ کو غرناطہ پہنچنے پر مکمل کیا۔ جبکہ ابن بطوطہ وہ مسلمان سفر نامہ نگار ہے، جو مسلسل تیس برس تک سفر کرتے ہوئے سیاحت میں رہا۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے وہ حجاز مقدس کے سفر کی غرض سے اپنے وطن سے نکلا، اور اس نے شمالی افریقہ اور شام کا سفر کیا۔ عراق، ایران، اور ایشیائے کوچک کی سیاحت کی۔ قسطنطنیہ اور کریمیا گیا۔ سمرقند و بخارا ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ ابن بطوطہ جزائر، مالدیپ، ساحلِ مالابار، لنکا، اور سماٹرا بھی گیا۔ ۱۳۵۰ء میں وہ اپنے وطن طنجہ (مراکش) واپس پہنچا۔ دنیا کے مختلف ملکوں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور مختلف اقوام کی معاشرت کے متعلق، اس نے اپنے "سفر نامہ" میں بہت اہم معلومات درج کی ہیں۔

"سفر نامہ" نثری ادب کی ایسی صنفِ سخن ہے، جس میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر پیش آمدہ واقعات و مشاہدات کو قلم بند کرتا ہے۔ دوران سفر خارجی مناظر، ماحولیات کے مشاہدے، مقامِ سفر کا جغرافیہ، اس کی علمی، تہذیبی و ثقافتی تاریخ، معاشرتی اقدار، تہذیب و ثقافت اور دیگر ضروری معلومات کو "سفر نامہ" میں تحریر کر کے قارئین کو وسیع تر معلومات کی فراہمی کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس حقیقت کو فراموش نہیں کی جاسکتا کہ اردو زبان و ادب میں "سفر نامہ نگاری" کی روایت عربی، فارسی، اور دیگر عالمی زبانوں کے مقابلے میں صدیوں بعد قائم ہوئی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری دور اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں مختلف زبانوں میں لکھے گئے سفر ناموں کے تراجم نے اردو سفر نامہ کی روایت کے فروغ واستحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلم دنیا میں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں لکھے گئے سفر ناموں، جن میں ابو ریحان البیرونی، ابن جبیر اندلسی، ابن بطوطہ اور حکیم ناصر خسرو کے سفر ناموں نے مسلم دنیا کے مختلف ممالک کی تاریخ و ثقافت، تہذیب و تمدن، علمی روایات، نام ور محدثین، علماء وفقہاء، حکماء و فلاسفہ، اور مسلم دنیا کی اعلیٰ علمی و تہذیبی اقدار و روایات سے آگاہی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ سفر نامے اس دور کی علمی، تہذیبی اور اعلیٰ تاریخی اقدار و روایات کے امین ہیں۔

اردو زبان وادب میں "عجائباتِ فرنگ" کو اردو کا پہلا سفر نامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جسے یوسف خان کمبل پوش نے فارسی میں تحریر کیا، پھر خود ہی اسے اردو میں منتقل کیا۔ "عجائبات فرنگ" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوا۔ (۱)

اردو سفر ناموں کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے "فہارس الاسفار" میں ضیاء اللہ کھوکھر نے عبد المجید کھوکھر لائبریری گجرانوالہ کے ذخیرہ کتب میں موجود ۱۸۵۱ء سے ۲۰۰۴ء تک شائع ہونے والے ایسے ۱۳۰۰ اردو سفر ناموں کا جامع اشاریہ پیش کیا ہے، جس سے اہل علم اور مطالعے کے شائقین میں "سفر نامہ" کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

---

(۱) بہ حوالہ: فہارس الاسفار / مرتب ضیاء اللہ کھوکھر۔ ناشر: عبد المجید کھوکھر لائبریری، گوجرانوالہ، ۲۰۰۴ء۔ ص: ۱۶۔

مختلف اسالیب و مناہج میں لکھے گئے اردو سفر نامے ایک محتاط اندازے کے مطابق تادمِ تحریر دو ہزار سے زائد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر کتب خانوں کی زینت بن چکے ہیں۔

کامران اجمل

تقریظ

دیارِ محدثین میں چند دن (سفر بخارا و سمر قند)

(حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں علمی و مطالعاتی سفر کی سر گزشت)

پیشِ نظر "سفر نامہ از بکستان" استاذ شعبہ تخصص فی الحدیث جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، مولانا محمد کامران اجمل دامت بر کاتہم کی وہ علمی کاوش ہے، جس میں موصوفِ محترم نے محققِ کبیر، نابغہ عصر، استاذ المحدثین، مشرف و نگراں شعبہ تخصص فی الحدیث جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، میرے معلّم و مربی، والدِ گرامی قدر، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیّت میں "اُز بکستان"، "بخارا و سمر قند" کے علمی، تاریخی، اور مطالعاتی سفر کی سر گزشت نہایت دل چسپ، بصیرت افروز اور عالمانہ اسلوب میں بیان کی ہے۔ اس یاد گار، تاریخ ساز، مطالعاتی سفر میں پچاس کے قریب علماء کا ایک نمائندہ وفد شریک تھا۔

مولانا کامران اجمل حفظہ اللہ نے "از بکستان"، "بخارا و سمر قند" کے اس یاد گار علمی و تاریخی سفر کے احساسات، مشاہدات اور سر گزشت کو علمی و ادبی اسلوب میں قلم بند کرتے ہوئے، اسے باضابطہ "سفر نامہ" کی صورت میں مرتّب و مدوّن اور نہایت سلیقے سے تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس طرح پیشِ نظر سفر نامے کے مؤلفِ محترم نے اپنی اس علمی کاوش میں قارئین کرام کو از بکستان کے دو بڑے اور اہم شہروں "بخارا و سمر قند" سے بخوبی متعارف کروایا ہے، موصوف نے سمر قند و بخارا کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت سے وابستہ کتنے بند باب قارئین کے سامنے وا کیے ہیں، اور انگنت نئ اور دل چسپ معلومات سے متعارف کروایا ہے۔

چوں کہ مذکورہ سفر نامہ "از بکستان" "بخارا و سمر قند" سے متعلق ہے۔ لہٰذا اس بارے میں اختصار اور جامعیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے از بکستان سے متعلق چند مفید معلومات پیشِ خدمت ہیں:

"ازبکستان" کا کل رقبہ ۴۴۷۴۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ یہ وسط ایشیا کی ان اسلامی ریاستوں میں سے ایک ہے، جو پہلے روس کے زیرِ تسلط تھیں۔ اس کی سرحدیں مغرب میں ترکمانیہ، شمال میں قازقستان، مشرق میں کرغستان، اور تاجکستان، اور جنوب میں افغانستان سے ملتی ہیں۔

"ازبکستان" دنیا کے قدیم ترین تہذیبی علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہاں کی مسلم آبادی ۸۸ فی صد پر مشتمل ہے۔ جبکہ عیسائی ۹ فی صد، اور دیگر غیر مسلم ۳ فی صد ہیں۔ "تاشقند" ملک کا صدر مقام ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ وسط ایشیاء کا سب سے بڑا ملک ہے، اسے وسط ایشیاء کا دل بھی کہا جاتا ہے۔

۱۸۶۵ء میں روس نے اس پر قبضہ کر لیا، اور ۱۹۲۴ء میں باقاعدہ طور پر اسے اپنا حصہ بنالیا، اور اپنی مصلحت کے پیشِ نظر "بخارا و سمرقند" کے قدیم شہروں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے عظیم مراکز کے بجائے تاشقند کو ازبکستان کا دار الحکومت بنایا، تاشقند اور فرغانہ ۱۸۶۵ء میں زار روس کے زیرِ تسلط آئے تھے۔

روس کے ٹکڑے ہونے کے بعد ۲۹ اگست ۱۹۹۱ء کو ریاست ازبکستان ایک آزاد اور خود مختار مملکت بن گئی۔ ازبکوں کی ایک تہائی آبادی وادیِ فرغانہ میں آباد ہے۔ یہ وادی اسلامی ورثہ سے مالا مال ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کے بانی ظہیر الدین بابر اور صاحبِ ہدایہ قاضی برہان الدین فرغانی مرغینانیؒ اسی سرزمین اور اسی وادی کے فرزند تھے۔

سوویت دور کے خاتمہ کے بعد "ازبکستان" اپنے ماضی کا ورثہ ڈھونڈنے میں مصروفِ عمل ہے۔ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے ازبکستان وسط ایشیا کی رہنما ریاست ہے۔

"سمرقند و بخارا" اسلامی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار اور ہماری صد افتخار دینی و ملّی تاریخ کے امین، اور ملّتِ اسلامیہ اور مسلم دنیا کے علمی، دینی اور تہذیبی ورثے کے نمایاں سنگِ میل ہیں۔ مہذّب انسانی تاریخ کے کسی دور نے ایسی انمٹ، ناقابل فراموش، اور قابل صد افتخار یادگاریں نہیں چھوڑیں، جو "سمرقند و بخارا" کی

تاریخ سے وابستہ ہیں۔ بلاشبہ، یہاں کے ذرے ذرے میں شمس و قمر خوابیدہ ہیں۔ وہ خاکی جن کی بنیاد نوری تھی، وہ بندے جو نیک صفات اور عباد الرحمٰن تھے۔ اس سرزمین میں آرام فرما ہیں۔ یہ امام بخاری، امام ترمذی، امام ابو منصور ماتریدی رحمہم اللہ جیسے علماء و محدثین، شیخ بہاء الدین نقشبندی رحمہ اللہ جیسے مشائخ، علی شیر نوائی جیسے قادر الکلام شاعر، ابو علی سینا جیسے عظیم مسلم سائنسدان، البیرونی اور فارابی جیسے نابغہ روزگار فلاسفہ کی سرزمین ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ساتویں صدی ھجری اور تیرہویں صدی ہجری وہ ادوار ہیں، جب اسلام دشمن طاغوت اور کفر کے طوفانِ بلاخیز نے اس خطے کے مسلمانوں کی زندگی اور تہذیب و ثقافت کو درہم برہم کر دیا۔ ساتویں صدی ہجری میں منگولیا سے چنگیز خان کی درندگی اور سفاکی کا طوفانِ بلاخیز اٹھا، اور خاکِ سمرقند و بخارا کو تہہ و بالا کر دیا۔ جبکہ تیرہویں صدی ہجری میں ایک مرتبہ پھر اسلامی تہذیب و تمدن کا یہ مرکز زار روس کی بدترین جارحیت اور کمیونزم کے اثرات کے نتیجے میں کفر کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

ساتویں صدی ہجری کا نصفِ ثانی وہ زمانہ اور وہ حالات تھے جب تاتاری ابتداً اپنے سردار اور قائد چنگیز خان کی قیادت میں عذابِ الٰہی کی طرح عالمِ اسلام کے مشرقی حصے، ایران و ترکستان کی طرف بڑھے، اور تباہی اور بربادی، سفاکی و درندگی کا استعارہ بن گئے۔ تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور اسے ایک تودہ خاک بنا دیا۔ پھر سمرقند کو خاکِ سیاہ کر دیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ تاتاری یورش عالمِ اسلام کے لیے بلائے عظیم تھی، جس سے عالمِ اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان مبہوت و ششدر تھے۔ عالمِ اسلام ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوف و ہراس اور یاس کے عالم میں تھا۔ تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا۔ ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل قیاس سمجھی جاتی تھی۔[1]

بالآخر یہ وحشی عالم اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے، اور شہروں کو آگ لگاتے، ٦٥٦ ہجری میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کے دار الخلافہ اور اس زمانے کے سب سے بڑے علمی و تمدنی مرکز اور متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے، اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ قریب

---

(١) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی / تاریخ دعوت و عزیمت، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ١٩٦٩ء۔ ١/ ٣١٤۔

تھا کہ سارا عالمِ اسلام اس سیلابِ بلاخیز میں بہہ جائے، اور اسلام کا نام ونشان بھی مٹ جائے کہ دفعتاً تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام کا آغاز ہوا، اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور عالمِ اسلام کے سلاطین وفرماں روانہ کرسکے، اور وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا، اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا، تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابلِ تسخیر قوم کا اسلام سے مسخر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہوجانا ہے۔ غرض اس طرح تاتاری قوم جس نے پورے عالمِ اسلام کو پامال کرکے رکھ دیا تھا، اور جس کے سامنے کوئی زمینی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند ہی برس کے عرصے میں اسلام کی حلقہ بگوش ہوگئی، اور اسلام نے دوبارہ اس بات کا ثبوت دیا کہ اسے اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دامِ محبت میں اسیر کرنے کی عجیب وغریب قدرت حاصل ہے۔ "سمرقند وبخارا"، بغداد اور عالمِ اسلام کے دیگر شہروں کو تاراج کرنے والے تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے، بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، اور بڑے بڑے عالم وفقیہ، اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے، اور انہوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فریضہ بھی انجام دیا۔ (۱)

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے ہاتھوں اور تیرہویں صدی ہجری میں سمرقند وبخارا، ازبکستان اور وسط ایشیائی ریاستوں کے مسلمانوں پر کمیونزم کے علم برداروں کے ہاتھوں عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ سوویت انقلاب، کمیونزم کے غلبہ وتسلط، زار روس کی جارحیت اور کمیونسٹ سرخ انقلاب کے دور میں یہاں کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی، ہزاروں علماء کو بے دردی سے قتل کیا گیا، تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ علماء اور دینی حلقوں کا اس شدت سے قتلِ عام کیا گیا کہ ان کی لاشوں کے انبار لگاکر کرینوں کے ذریعے اس پر مٹی ڈال دی گئی، ایسی اجتماعی قبریں آج بھی یہاں متعدد مقامات پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسلامی تشخص، دینی ومذہبی اقدار پر پابندی عائد کی گئی، مساجد پر تالے ڈال دیے گیے، مساجد ومدارس کو قانوناً بند کر دیا گیا۔ اسلام، مسلمان اور اسلامی تشخص

---

(۱)(تاریخ دعوت وعزیمت، ۱/۳۳۴۔

کے خاتمے کے لیے جو کچھ اور جیسا کچھ ممکن تھا، کیا گیا۔ اسلامی تہذیب کے اثرات کو مٹانے کے لیے اشتراکی روس نے کئی مہمیں چلائیں، ان میں لاکھوں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور اہم شخصیات کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ نئی تعلیم اور جدید تہذیب سکھانے کے بہانے دینی شعائر اور اسلامی اقدار پر کاری ضرب لگائی گئی۔ ظالمانہ تشدد اور جبر و تشدد کے ذریعے اسلام دشمنی اور الحاد اور لادینیت کی مہم چلائی گئی۔ مسلمانوں کا دینی اقدار اور ماضی سے رشتہ توڑنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا گیا، عربی رسم الخط پر پابندی عائد کی گئی۔ ایک صدی پر محیط اشتراکی تسلط کے دوران پچیس ہزار مساجد اور مدارس ڈھائے گیے۔ ۱۹۸۰ء تک یہاں مسجدوں کی تعداد چار سو پچاس رہ گئی تھی، لیکن تمام تر ظلم و استبداد، جبر و تشدد کے باوجود روسی یہاں صدیوں سے موجود اسلامی اقدار کو اکھاڑ نہ سکے۔

ایک صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط اس جبر واستبداد، غلبہ و تسلط اور بدترین مظالم کے باوجود سمرقند و بخارا آج بھی اسلامی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار، اسلامی تشخص، دین مبین کی سربلندی، اور اسلام کی عظمت و حقانیت کا روشن نشان ہیں۔

۱۹۹۱ء کے آخر میں اللہ عزوجل نے سمرقند و بخارا اور وسط ایشیاء کی ریاستوں کو آزادی کی نعمت سے مالامال فرمایا، اور کمیونزم کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ تقریباً ایک صدی پر محیط طویل عرصہ روس کے زیرِ اثر رہنے کے بعد ازبکستان نے نومبر ۱۹۹۱ء میں اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا تو بخارا و سمرقند "ماوراء النہر" سے منسوب اس خطے کے مسلمان دوبارہ شعائر اسلام کی طرف آنے لگے ہیں۔ یہاں مساجد از سرِ نو آباد اور دینی مدارس بتدریج قائم ہو رہے ہیں، جہاں ہزاروں طلبہ ان مدارس میں دینی تعلیم حاصل کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

"سمرقند و بخارا" ترکستان اور ماوراء النہر کے درمیان واقع، وہ دو عظیم تاریخی شہر ہیں، جن سے اسلامی تمدن اور ملّتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کی بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ یہ ترکستان کے دو مشہور دریاؤں سیحون اور

جیحون کا درمیانی منطقہ ہے۔ جسے نئی سیاسی تقسیم میں ازبکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ازبکستان کا وسطیٰ علاقہ جو سمرقند و بخارا کا اصل خطہ ہے، تاریخ قدیم میں "سغد / صغد" کہلاتا تھا۔

اسلام کے عظیم دینی، علمی اور تہذیبی ورثے کے امین اور ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کے سنگِ میل "بخارا و سمرقند" سے ایسی قابلِ صد افتخار اور جلیل القدر ہستیوں، بلند پایہ محدثین، فقہاء، مفسرین اور ہر شعبہ علم سے وابستہ حضرات کا تعلق رہا ہے، جو ہر لحاظ سے اپنے اپنے شعبوں کے امام اور جلالتِ علمی کے حامل ہیں۔

ازبکستان کے مشرقی، وسطی اور جنوبی سرحدوں سے ملے ہوئے دوسرے ترکستانی علاقے بھی قدیم تاریخی مقامات رکھنے والے خطے رہے ہیں، جن میں مشہور اہل علم و دین پیدا ہوئے۔ دریائے جیحون میں واقع ان خطوں میں خراسان کے حصے کیے جاتے تھے۔ ان میں سے قریب کے مقامات میں بلخ اور بدخشاں موجودہ افغانستان کے شمالی حصے میں واقع ہیں۔ جبکہ مرو و سرخس موجودہ ترکمانستان میں ہیں، ماوراء النہر اور اس کے جنوب کے ان علاقوں میں علومِ دینیہ کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا۔ "بخارا" "سمرقند" سے بجانبِ جنوب مغرب سو کلومیٹر پر واقع ہے۔ ۲۷۰۰ سال قدیم یہ شہر قدیم تہذیبی آثار کے ساتھ ساتھ اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کے شاندار ماضی، مثالی اسلامی تہذیب و تمدن، مختلف علوم و فنون میں محدثین، علماء، فقہاء، صلحاء، فلاسفہ، اور ہر شعبہ علم سے وابستہ اہل علم و دانش حضرات کی شاندار، قابل افتخار اور ہمہ گیر خدمات، مسلمانوں کے شاندار ماضی اور امت مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کا امین ہے۔ یہاں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسی مثالی شخصیات پیدا ہوئیں، جنہوں نے صفحہ عالم اور دنیا کی رہ گزر پر تاریخ ساز اور ان مٹ نقوش ثبت کیے۔

یہ حدیث و محدثین کے قافلہ سالار، امیر المؤمنین فی الحدیث، امام المحدثین حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی جائے پیدائش و وطن ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد دیگر خصوصیات کا حامل شہر ہے، "بخارا" نے دوسری اور تیسری صدی ہجری ہی سے حدیث نبوی ﷺ اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم و تعلّم اور علوم نبوی ﷺ کی ترویج و اشاعت میں ناقابل فراموش اور تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ جبکہ بعد کی صدیوں اور اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں "سمرقند و بخارا" نے دینی علوم اور اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ و ارتقاء میں جو تاریخ ساز

کردار ادا کیا، وہ ہر لحاظ سے ممتاز اور مرکزی اہمیت کا حامل ہے، چنانچہ یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینی علوم کے مرجع و منبع ”سمرقند و بخارا“ عالمِ اسلام کے ممتاز ترین مقامات میں شمار ہوتے تھے۔ خاص کر ”بخارا“ میں ڈھائی سو مدارس اور ساڑھے تین سو سے زائد مساجد تھیں۔ علمی اور دینی لحاظ سے یہ پورے ماوراء النہر کا مرکز بن گیا تھا۔ سرزمین بخارا کا یہ علمی فیضان صدیوں جاری رہا۔ آج بھی یہ خطہ اسلام، ملّتِ اسلامیہ، اور عظیم اسلامی روایات کا آئینہ دار ہے۔”ماوراء النہر“ کے مختلف خطوں میں بے شمار صلحاء، علماء، فقہاء، محدثین اور مبلغین پیدا ہوئے، جگہ جگہ درس گاہیں اور دینی مدارس قائم ہوئے، جہاں تشنگانِ علم دور دور کے بلاد و امصار سے آکر فیض یاب ہوتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے، اور بعض مقامات تو عالمی مرکز بن گئے تھے۔ (۱)

مولانا جامی نے شاید یہی محسوس کرتے ہوئے کہا تھا!

سکہ کہ در یثرب و بطحازدند
نوبت آخر بخارا زدند

ترکستان، سمرقند و بخارا اور اس کے اطراف و جوانب کے علماء و صلحاء، فقہاء و محدثین اور ہر فن کے نام ور علماء کا علمی و دینی فیض سارے عالم اسلام کو پہنچا۔ حدیث نبوی ﷺ میں امام بخاری اور امام ترمذی، امام نسائی رحمہم اللہ جیسے اولین ائمہ حدیث پیدا ہوئے، فقہ اور اصول میں اس خطے کو امتیاز حاصل ہوا۔ فقہ حنفی کی عظیم کتاب ”المبسوط“ کے مؤلف امام سرخسیؒ اور دوسرے بڑے مصنف اور بلند پایہ فقیہ فخر الدین بن منصورؒ صاحبِ ”فتاویٰ قاضی خان“، مشہور امام و فقیہ امام مرغینانیؒ صاحبِ ”ہدایہ“، علاء الدین محمد بن احمد سمرقندیؒ صاحب ”تحفۃ الفقھاء“، امام ابو بکر محمد بن اسماعیل بن قفال الشاشیؒ اور ملا علی قاریؒ جیسے بلند پایہ مؤلفین اسی خطے کے تھے رحمہم اللہ اجمعین۔ اسی طرح امام ابو بکر کاسانیؒ صاحب ”بدائع الصنائع“، امام ابو البرکات عبد اللہ نسفیؒ صاحب تفسیر ”مدارک التنزیل“، علامہ عبد الرحمن تیمی دارمی سمرقندیؒ صاحب ”مسند

---

(۱) مولانا سید محمد رابع ندوی / سمرقند و بخارا کی بازیافت، ص:۳۸، مطبوعہ مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

دارمی"، اسی علاقے کے تھے۔ یہ وہ علماء وفقہاء اور محدثین ہیں، جن کی حدیث وفقہ کی کتابیں مدارسِ دینیہ کے نصاب میں داخل رہیں۔ نام ور امام طب و فلسفہ ابن سیناصاحب کتاب "الشفاء في الطّب"، مشہور فلسفی ابو نصر فارابی اور علم کلام کے امام ابو منصور ماتریدی، جغرافیہ و فلکیات کے ماہر احمد بن محمد الفرغانی، دیگر علماء میں ابو محمود الخجندیؒ، شمس الدین السمرقندیؒ، احمد بن عمر السمرقندیؒ، مختلف علوم کے ماہر ومؤلف ابو ریحان البیرونیؒ، اور مشہور ریاضی دان محمد بن موسی الخوارزمیؒ، اور سائنسی علوم کے دائرہ معارف "مفتاح العلوم" کے مصنف ابو عبد اللہ محمد بن احمد الخوارزمیؒ، تفسیر وادب اور نحو کے ماہر علامہ زمخشریؒ اور عظیم ادیب ابو بکر الخوارزمیؒ، بلاغت و ادب کے مشہور مصنف علامہ سکاکیؒ اور علامہ سعد الدین تفتازانیؒ صاحب "مختصر المعاني" انہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تصوف و تزکیہ کے عظیم ترین شیوخ خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ، بانی طریقہ نقشبندیہ، خواجہ عبید اللہ احرارؒ، حضرت نجم الدین کبریؒ، جن کے سلاسلِ تصوف سے پورابرِ صغیر مستفید ومستنیر ہو رہاہے، انہی علاقوں کے تھے۔(۱)

"دیارِ محدثین میں چند دین"(سفر بخاراو سمرقند) میں سفر نامہ ازبکستان کے مؤلف مولانا کامران اجمل صاحب نے اس یادگار علمی و مطالعاتی سفر، جس میں ملک بھر کے علماء کا ایک نمائندہ وفد شریک تھا۔ سفر بخاراو سمرقند کے مشاہدات، سرگزشت، لمحہ بہ لمحہ اور قدم بہ قدم یادداشتوں کو عام فہم، دل کش اور متاثر کن اسلوب میں قلم بند کرتے ہوئے، اسے باضابطہ "سفر نامہ" کی صورت میں مرتّب و مدوّن کر کے اس یادگار سفر سے متعلق مفید معلومات، مشاہدات، اور شریکِ سفر علماء کے احوال و معمولات کو بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دیاہے۔

سفر بخارا و سمرقند جس میں استاذ العلماء، محققِ کبیر، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی نعمانی نور اللہ مرقدہ جو علماء ومشایخ کے اس نمائندہ وفد میں سب سے کبیر السّن، اور اس علمی و مطالعاتی سفر کے قافلہ سالار تھے، کے علاوہ مولانا مفتی حسن صاحب، مولانا قاضی ارشد الحسینی صاحب، مولانا شیر جان صاحب، مولانا ڈاکٹر

---

(۱) سمرقند وبخارا کی بازیافت، ص:۴۰

محمد ادریس سومرو صاحب، سفر نامہ کے مؤلف و مدوّن مولانا کامران اجمل صاحب، مولانا یاسر عبد اللہ صاحب، مولانا عمران ممتاز صاحب، مولانا قاری عبد الرحمن رحیمی صاحب، مولانا عزیز الرحمن رحمانی صاحب، مولانا طلحہ رحمانی صاحب، مولانا عبد اللہ شاہ مظہر صاحب، مولانا رضوان عزیز صاحب، مولانا ثناء اللہ صاحب، مفتی طاہر مسعود صاحب، مولانا محمد طیب صاحب، مولانا سلمان انبالوی صاحب، اور بعض دیگر علماء شریک سفر تھے۔

سفر نامہ میں جہاں ازبکستان کے تہذیبی و ثقافتی مراکز تاشقند، بخارا و سمرقند کے علمی مراکز، مساجد، دینی مدارس، کتب خانوں، خانقاہوں، چلہ خانوں کا تذکرہ و تعارف اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہیں اس خطے کے معروف علماء، محدثین، فقہاء، صوفیاء، اور ہر شعبہ علم سے وابستہ حضرات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ وفد میں شامل علمائے کرام کی ان علماء محدثین ، فقہاء وصوفیاء کے مقابر ومزارات کی زیارت و حاضری کی کیفیت کو جس اسلوب و انداز میں بیان کیا ہے، اس سے علماء کی ان حضرات سے عقیدت و محبت اوراسلامی تہذیب و ثقافت کے عظیم مراکز "سمرقند وبخارا" سے ان حضرات کے قلبی و روحانی تعلق، اور عقیدت و مودّت کا پتہ چلتا ہے۔ "سمرقند و بخارا" کے تاریخی مقامات اور یہاں کے چپے چپے کی زیارت اور حاضری کے موقع پر علمائے کرام بالخصوص استاذ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی نعمانی رحمہ اللہ کے احساسات، مشاہدات، احوال و معمولات و کیفیات کو جس اسلوب و منہج میں فاضل مؤلف مولانا کامران اجمل حفظہ اللہ نے بیان کیا ہے، اس سے موصوف محترم کی اپنے معلّم ومربی استاذِ محترم سے غایت درجہ عقیدت و محبت، ادب واحترام، تعلقِ خاطر، اور خلوص ووفا کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

بنیادی طور پر "دیار محدثین میں چند دن" ایک ایسا سفر نامہ ہے جس میں فاضل مؤلّف نے سفر سمرقند و بخارا میں اپنے مشاہدات، تجربات، مسلم دنیا کے قدیم علمی، تہذیبی اور ثقافتی مراکز کے متعلق نہایت وقیع اور گراں قدر معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ ایک اچھے سفر نامے کی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کا مصنف و مؤلف نت نئی سر زمین، بلاد وامصار کی تہذیب وثقافت اس سے وابستہ تاریخ اور معلومات کے دریچے اس طرح کھولے کہ قارئین اس کے مشاہدات واحساسات کے ساتھ شریکِ سفر ہو جائیں۔ اس سفر نامہ کی علمی وادبی سرگزشت

بھی کچھ اسی نوعیت کی ہے، اس میں سمرقند و بخارا کی دینی، تہذیبی، ثقافتی اور اسلامی تاریخ کو علمی اسلوب میں قلم بند کیا گیا ہے۔

بلا شبہ، متعلقہ موضوع پر لکھے گئے سفر ناموں میں یہ ایک عمدہ اضافہ ہے، جسے علماء اور اہل علم و دانش میں خوب خوب پزیرائی حاصل ہو گی۔

پیشِ نظر سفر نامہ "سفر بخارا و سمرقند" جسے "دیارِ محدثین میں چند دن" سے موسوم و مُعنون کیا گیا ہے، ازبکستان کے قدیم تاریخی، تہذیبی و ثقافتی مراکز کے تعارف کے ساتھ ساتھ اس دیار کے نامور محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء اور ہر شعبہ علم سے وابستہ مشاہیر کا ایمان افروز تذکرہ اور سمرقند و بخارا کی تاریخ و تہذیب، تمدن و معاشرت، شاندار اور قابلِ افتخار ماضی کا حسین بیانیہ اور اس حوالے سے بعض اہم معلومات کا جامع مرقع ہے۔

دعا ہے کہ اللہ عزوجل اس مخلصانہ علمی کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ (آمین)

(مولانا ڈاکٹر حافظ) محمد ثانی، کراچی

استاذ شعبہ تخصص فی الحدیث

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، کراچی

صدر شعبہ قرآن و سنّہ وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی

١٠ رمضان المبارک ١٤٤٤ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سفر نامہ بخارا و سمرقند

سفر کے آداب:

سفر اللہ تبارک وتعالی کے نعمتوں میں سے ایک نعمت عظمی، بلکہ اللہ کی قدرت کو سمجھنے کا ایک بہترین وسیلہ وذریعہ بھی ہے، یہی سفر اگر اللہ کی نافرمانیوں کے بغیر کیا جائے اور اس میں اللہ کی قدرت اور اس کے فیصلوں کو دیکھا جائے، اچھے لوگوں کے ساتھ ہونے والے معاملہ اور برے لوگوں کو ملنے والی سزا، ان کی نافرمانیوں پر ان کا ہونے والا انجام دیکھنا مطلوب ہو تو نعمت ہے، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے، چنانچہ جگہ جگہ پر اس غرض سے سفر کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِيْ الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾[النمل:٦٩].

اور اگر سفر اللہ کی نافرمانی کے ساتھ ہو تو یہی سفر اللہ کی پکڑ اور عذاب کا ذریعہ بھی ہے اور پکڑ کی ابتدا کی علامت بھی، ملاحظہ فرمائیں:

﴿لَايَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾[آل عمران: ١٩٦-١٩٧].

حصول علم کے لیے سفر انبیاء کرام علیہم السلام کا وطیرہ رہا ہے، حضرت موسی علیہ السلام کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں، اپنے سے اعلم کا پتہ چلا تو فوراً اجازت لے کر ان کی طرف روانہ ہوئے اور یہ تک کہہ دیا کہ:

﴿لَاأَبْرَحُ حَتّٰىٓ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا﴾ [کهف: ٦٠].

شعراء نے بھی سفر کو پختگی مزاج کے لیے لازمی قرار دیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ صوفی اس وقت تک صافی نہیں ہوگا، جب تک اللہ کے عشق کا جام نہ پی لے، سفر زیادہ سے زیادہ کرنے چاہیے تاکہ خام مال پختہ ہو جائے، شعر ملاحظہ فرمائیں:

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

اور اہل معرفت کا یہ جملہ بھی بہت مشہور ہے: ”سفر سقر ہے گرچہ وسیلہ ظفر ہے“۔

سفر کی تاریخ

چونکہ سفر کوئی ایسی چیز نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام یا ان کے پیروؤں سے منقول نہ ہو اس لیے سفر کی تاریخ اور ابتدا دیکھنی ہو گی تو ابتدا آفرینش ہی سے دیکھنی ہو گی؛ کیونکہ سفر دنیا کی ابتدا کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، انسان کا پہلا سفر جنت سے دنیا کی طرف ہے اور پھر دوسرا سفر دنیا سے آخرت کی طرف ہو گا، دنیا کی ساری رہائشیں فقط اسٹیشن کے درجہ میں ہیں، بلکہ آپ علیہ السلام نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ دنیا کو اپنی رہائش گاہ مت سمجھنا یہ تو سفر ہے، آپ علیہ السلام نے اپنی لسان نبوت سے ارشاد فرمادیا: «كُنْ فِيْ الدُّنِيَا كَأَنَّكَ غَرِيْب أَوْ عَابِرُ سَبِيْل [1]» دنیامیں مسافر کی طرح رہو، بلکہ ایسے جیسے کوئی راہ گزر ہو۔

اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ انسانی سفر انسانیت کے جنت سے نکالے جانے سے شروع ہو کر دوبارہ آخرت تک رہتا ہے، اس کے بعد جنت کے اندر کا سفر تو رہے گا، لیکن جنت سے باہر کا کوئی سفر نہ ہو گا، جنت میں بھی سفر کے لیے کوئی معمولی سواری نہ ہو گی، بلکہ اللہ تعالی جنت کے لیے ”براق“ جیسی تیز رفتار سواری عطا فرمائیں گے جس کی رفتار نگاہ کی طرح دور تک پہنچتی ہے، معلوم ہوا کہ جنت میں بھی سفر جاری رہے گا، اگرچہ وہ سفر محض تفریح یا پھر انبیاء کرام علیہم السلام سے ملاقات یا رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے ہو گا، لیکن اتنی بات طے ہے کہ سفر ہو گا۔

---

(۱) صحیح بخاری، ص: [۱۳۵۴]، دار التاصیل.

سفر کے مقاصد

جب سفر ایسی چیز ہے جو جنت سے شروع ہوئی اور جنت میں بھی ختم نہیں ہوگی، اور ظاہر سی بات ہے کہ ہر کام کے کرنے سے کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے، تو دنیا کے اس سفر میں انسان کے کچھ مقاصد ہوں گے، وہ مقاصد کیا ہیں؟ بندہ کے خیال میں سفر درج ذیل مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے:

۱- اطاعت خداوندی:

۲- دنیا کمانا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «من كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها فهجرته الى ما هاجر اليه»، معلوم ہوا کہ ہجرت اللہ و رسول اور دنیا دونوں کے لیے کی جاتی ہے۔

۳۔ پچھلی امتوں کے انجام کو دیکھنا:

اللہ تبارک و تعالی کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِيْ الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْن﴾

۴- حصول علم:

حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر سے کہا:

﴿لَاأَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا﴾ [كهف: ٦٠].

اور اسی سفر کے بارے میں فرمایا جب حضرت خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے تو فرمایا:

﴿أَنْ تُعَلِّمَنِيْ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْداً﴾. [کهف: ٦٦].

۵- غلبہ پانے اور ملکوں کو فتح کرنے کے لیے سفر کرنا:

حضرت ذوالقرنین کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْماً﴾. [کهف: ٨٦].

﴿قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَأَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ﴾ [کهف:٩٥].

۶- گناہوں سے خود کو بچانے کے لیے:

حدیث شریف میں بنی اسرائیل کے اس شخص کا تذکرہ ہے جس نے سو قتل کئے اور پھر نیک ہونے کا ارادہ کیا، جس عالم سے ملاقات ہوئی انہوں نے اسے نیکوں کی بستی میں جانے کے لیے کہا تا کہ اپنی بستی میں رہ کر انہیں گناہ یاد نہ آئیں اور راستے میں ان کا انتقال ہو گیا اور فرشتوں نے نیکوں کی بستی کے قرب کی وجہ سے اسے جنت کے فرشتوں کے حوالے کیا[1]۔

۷- اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے:

۸- حصول رزق کے لیے:

ارشاد فرمایا:

﴿عَلِمَ أَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَرْضَىٰ وَآخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِيْ الْأَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ

---

(۱) بخاری، ص:[۷۲۹].

اللهِ وَآخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ [مزمل: ٢٠].

۹- حج بیت اللہ کے لیے:

﴿وَأَذِّنْ فِيْ النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالاً وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ [حج:٢٧].

وَلله عَلَىٰ النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْه سَبِيْلاً﴾ [آل عمران: ٩٧].

۱۰- اللہ کی رضا کے لیے:

حضرت موسی علیہ السلام سے اللہ تبارک وتعالی نے پوچھا کہ اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی کیوں کی، تو انہوں نے جواب دیا کہ اے اللہ میں انہیں چھوڑ کر کوہ طور کی طرف سفر اس لیے جلدی کر آیا ہوں تاکہ آپ راضی ہو جائیں، ملاحظہ فرمائیں:

﴿وَمَا أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَامُوْسَىٰ۝ قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلَىٰ أَثَرِيْ وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضى﴾ [طٰه: ٨٤].

۱۰- دشمنوں سے حفاظت کے لیے بھی سفر کیا جاتا ہے:

جیسا کہ حضرات صحابہ کرام نے مشرکین مکہ کی تکالیف سے خود کو بچانے کے لیے کیا اور حضرت موسی علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالی نے بنی اسرائیل کو لے جانے کے لیے فرمایا کیوں کہ فرعون انہیں نقصان پہنچانا چاہ رہا تھا اور خود عین اس چلے جانے کے وقت بھی ان کا پیچھا کرتا رہا، ملاحظہ فرمائیں موسی علیہ السلام سے فرمایا:

﴿أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْ أَنَّكُمْ مُتَّبَعُوْنَ﴾ [شعراء: ٥٢].

آداب سفر

ہر کام کے کرنے کے لیے اگر ان کے آداب کا خیال رکھا جائے تو وہ کام بہت اچھا اور عمدگی کے ساتھ ہو جایا کرتا ہے، بنسبت بغیر آداب کے، اور بہترین آداب وہ ہوں گے جو کائنات کے با ادب ترین اشخاص نے اختیار کیے ہوں، چنانچہ سفر کے بارے میں بھی ہم یہی دیکھیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے بارے میں کن آداب کا خیال رکھا اور کن امور کو اختیار کیا؛ کیونکہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے خود سفر بھی فرمایا ہے، اس لیے اسی ترتیب کو اختیار کرنا باعث خیر وبرکت، باعث راحت وسکون اور باعث اجر وثواب بھی ہوگا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔

ذیل میں کچھ آداب سفر ذکر کیے جارہے ہیں، اگرچہ آداب سفر خود مستقل ایک موضوع ہے، جس پر مستقل اور مفصل لکھنا ہی بہتر ہے تاکہ امت کی رہنمائی ہو، لیکن یہاں صرف چند کو ذکر کیا جارہا ہے تاکہ اس پہلو کی طرف بھی نظر رہے، اور سفر نامہ کو محض سفر نامہ سمجھ کر پڑھنے کے بجائے آداب سفر پر توجہ دی جائے، مثلا:

۱- سفر میں کسی ایک کو امیر بنانا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی بھی کسی لشکر یا جماعت کو بھیجتے تھے تو کسی ایک کو اس میں امیر مقرر فرمایا کرتے تھے۔ (۱)

۲- سفر کے لیے پہلے سے انتظامات کرنا اور اپنے رفقاء سفر کو اس سے آگاہ کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر جاتے تو حضرات صحابہ کرام کو پہلے سے بتادیتے تھے تاکہ صحابہ کرام اس کے اعتبار سے تیاری کریں (۲)۔

۳- سفر اگر راز داری کا ہو تو راز کو راز رکھنا، فتح مکہ مکرمہ کے موقع پر جب آپ علیہ السلام روانہ ہونے سے پہلے بتایا تھا، اور ایک صحابی نے اس کے بارے میں اہل مکہ میں سے کسی کو اطلاع کردی تھی جس پر رسول

---

(۱) بخاری شریف، ص: [۹۰۴-۸۵۰-۸۲۸].

(۲) بخاری شریف، ص: [۹۱۷].

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار فرمایا اور پھر صحابہ کرام اس معاملے میں بہت محتاط ہو گئے تھے، اور بتلانے والے صحابی نے اپنے بتانے کا عذر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر فرما دیا تھا۔[۱]

۴- دوران سفر اگر کہیں پر اللہ کی خاص نشانیاں ہوں تو اس کو عبرت کی نگاہ سے دیکھنا اور رفقاء سفر کو اس سے آگاہ کرنا، چنانچہ ایک سفر میں جب مدائن صالح علیہ السلام کے پاس سے گزر ہوا تو صحابہ کرام کو جلد گزرنے اور عبرت حاصل کرنے کی ترغیب دی۔[۲]

۵- سفر کے اخراجات کو ملحوظ رکھنا، آپ علیہ السلام جب سفر پر جاتے تو اخراجات کا بندوبست فرمالیا کرتے تھے، چنانچہ کئی موقعوں پر سفر جہاد پر جانے سے پہلے چندہ کرنے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ترغیب دینا ثابت ہے۔[۳]

۶- سفر میں دوسروں کا خیال رکھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں کمزوروں وغیرہ کا خیال فرمایا کرتے تھے۔[۴]

۷- امیر کا آخر میں چلنا، یا کسی کو آخر میں اہتمام کے ساتھ سب کچھ دیکھ کر آنے کے لیے کہنا، تاکہ اگر کسی کا کوئی سامان وغیرہ رہ جائے تو اسے اٹھا سکے اور اس کے مالک تک پہنچا سکے۔[۵]

۸- جس جگہ جا رہے ہوں وہاں کے انتظامات کے لیے کچھ ساتھیوں کو پہلے سے بھیجنا، جو جگہ کی خبر گیری کرے اور انہیں بتلائے۔

۹- اس جگہ کے بارے میں معلومات کر لینا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب سندھ میں آنے والے آئے تھے تو انہوں نے یہ تبصرہ کیا تھا: «أرض سهلها، وماؤها وشل، وتمرها دقل،

---

(۱) بخاری شریف، ص: [۷۸۷]۔

(۲) بخاری شریف، ص: [۷۰۷-۹۲۰]۔

(۳) ابوداؤد، ص: [۲۴۸]، مکتبہ رحمانیہ.

(۴) بخاری شریف، ص: ۶۱۷۔

(۵) بخاری شریف، ص: ۸۶۳۔

وعدوها بطل، وخيرها قليل، وشرها طويل، والكثير بها قليل، والقليل بها ضائع، وماوراءها شر منها». [1]

۱۰- وہاں جانے سے پہلے انتظامات کرلینا، مقدمۃ الجیش کا یہی مطلب تھا کہ وہ پہلے جاکر انتظامات کرلیتے اس کے بعد لشکر جاتا تھا۔

۱۱- امیر سفر کا کاموں میں خود کو پیش کرنا، بلکہ خدمت میں پیش پیش رہنا، آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:«سيد القوم في السفر خادمهم» (قوم کا سردار سفر میں خادم ہوتا ہے)۔ [2]

۱۲- مشکل کاموں کے لیے خود کو پیش کرنا اور راحت والے کام دوسروں کے ذمہ لگانا، جیسا کہ مدینہ منورہ میں جب رات کے وقت ایک خوف کی کیفیت پیدا ہوئی تو آپ علیہ السلام اکیلے نکل کر گئے اور اسے دیکھا، غزوہ خندق کے موقع پر جب کھدائی کے دوران پتھر نہیں ٹوٹ رہا تھا تو آپ علیہ السلام آگے بڑھے۔ [3]

۱۳- گروپ کے افراد کو خیر کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا، آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا: «لاتصحب الملئكة رفقة فيها كلب ولاجرس». [4]

۱۴- گروپ کے لئے امیر کا دعا مانگتے رہنا، میدان بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے ہی مسجد عریش میں بیٹھے دعا مانگتے رہے اور تب اٹھے جب دعا قبول کروادی۔ [5]

۱۵- سفر میں خدانخواستہ کوئی بدمزگی ہوجائے تو خود آگے بڑھ کر قائدانہ طور پر اس مسئلے کے حل کی کوشش کرنا، ایک غزوہ میں جب انصار ومہاجرین کے درمیان بدمزگی ہوئی تو آپ علیہ السلام نے خود بڑھ کر

---

(۱) تاریخ طبری، ج:۴، ص:۱۸۲، بیروت لبنان۔

(۲) شعب الایمان، ج:۷، ص:۳۳۴، مکتبہ دار الباز۔

(۳) بخاری شریف، ص:۸۵۴۔

(۴) مسلم شریف، ص:۱۰۲۹، دار التاصیل۔

(۵) مسلم شریف، ص:۸۵۰۔

معاملے کو حل کیا۔ [۱]

۱۶- سفر میں رفقاء سفر کو خلق خدا کی تکلیف سے باز رکھنا، ایک سفر میں جب بعض صحابہ نے چڑیا کے بچوں کو چڑیا سے دور کیا تو آپ علیہ السلام نے خوب تنبیہ فرمائی۔ [۲]

۱۷- سفر میں اگر کسی چیز کی پریشانی ہو تو ساتھیوں کی حوصلہ افزائی بھی کرنا اور انتظامات کی صورت بنانا، جیسا کہ ایک سفر میں صحابہ کرام کے لیے پانی کی پریشانی ہوگئی تو آپ علیہ السلام نے دعا بھی فرمائی اور بوڑھی عورت کو پانی دینے کے لیے کہا پھر آپ علیہ السلام کا اس میں معجزہ ظاہر ہوا۔ [۳]

سفر میں احتیاطی تدابیر

سفر میں جس طرح سے آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے اسی طریقے سے احتیاطی تدابیر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے، یہ حفظ ماتقدم ہے؛ کیونکہ سفر میں جانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی پریشانی وغیرہ نہیں آئے گی، عین ممکن ہے کہ اس میں پریشانیاں آئیں اس لیے پہلے سے تیار رہنا ضروری ہے۔ چند تدابیر کا ذکر کیا جاتا ہے، باقی ہر شخص کے سفر کے لحاظ سے احتیاطات مختلف ہوسکتی ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

۱- کسی سے کوئی چیز نہ لی جائے، بسا اوقات کسی سے کوئی چیز لے کر انسان تکلیف میں یوں مبتلا ہوسکتا ہے کہ جس سے کوئی چیز لی اس میں کوئی ممنوعہ مواد ہوتا ہے جو انسان کے لیے بہت تکلیف کا باعث بن سکتا ہے۔

۲- کسی بھی ملک کے اندر وہاں کے لوگوں سے میل جول تو ضرور رکھے، لیکن غیر محتاط گفتگو سے پرہیز کرے، خصوصاً اس ملک کے سیاسی حالات پر تبصرہ اور اس کے حکمرانوں سے متعلق گفتگو۔

۳- اس ملک میں ممنوع اشیاء لے جانے سے گریز کرے۔

۴- اس ملک میں کونسی کرنسی کتنی لے جاسکتے ہیں اور کتنی ممنوع ہے اس کے بارے میں معلومات

---

(۱) بخاری شریف، ص:۷۴۳۔

(۲) ابوداؤد، ج:۷، ص:۵۴۰، رسالۃ العالمیہ۔

(۳) بخاری شریف، ج:۱، ص:۲۹۷، بشریٰ۔

حاصل کرلے۔

۵-کسی دوسرے کی طرف سے زیادہ مقدار میں رقم لے جانا جو ممنوع ہو یا ٹیکس کے وجوب کا سبب ہو، اس سے اجتناب کیا جائے۔

۶-سامان کی کثرت سے اجتناب کرے، کیونکہ یہ چیزیں بسا اوقات ائیر پورٹ میں رسوائی کا سبب بن جایا کرتی ہیں۔

۷-وہ کتابیں اور لٹریچر جو ان کے ہاں لے جانا منع ہو اگرچہ اس میں اچھی باتیں اور دینی علوم ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر اس ملک میں منع ہیں تو لے جانے میں احتیاط بہت ضروری ہے۔

۸-جن چیزوں کا استعمال جس جگہ ممنوع ہو اس جگہ لے جانے سے پرہیز کیا جائے۔

۹-ٹکٹ کے وقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ غلط فہمی کی وجہ سے جہاز وغیرہ چلا نہ جائے اور بلاوجہ وقت اور مال کا ضیاع ہو۔

اس ملک سے متعلق لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ

کسی بھی ملک میں سفر کرنے سے پہلے بہتر یہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے متعلق لکھی گئی کتابیں، سفر نامے اور دیگر جغرافیائی کتابوں کا مطالعہ کرلیں، تاکہ انسان علی وجہ البصیرت سفر کرسکے اور ساتھ اس میں دیکھنے کی جگہیں اور وہاں کی اہمیت کے بارے میں معلومات حاصل کرسکے، ان لوگوں کے بود و باش، ان کے طور طریقے جان سکے، وہاں کے لوگوں کا مزاج ان کے معاملات کے انداز سے واقف ہوسکے، غرض جب پہلے سے کسی بات کے بارے میں معلومات ہوں گی تو انسان بڑے اطمینان سے سفر بھی کرسکے گا اور سفر میں دوسروں کے تجربے کی وجہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکے گا، اس سلسلے میں چند کتابوں اور لکھے گئے مضامین کے بارے میں درج کیا جاتا ہے جو ان شاء اللہ مفید ثابت ہوں گے۔

۱-لاہور تا بخاک بخارا و سمرقند پیر ذوالفقار نقشبندی صاحب۔

۲-امام البخاری اور عظیم مسلم فاتحین کی سرزمین، بخارا و سمرقند ارسلان ہاشمی۔- جدہ

۳-رنگ برنگی دنیا، ازبکستان کی سیر۔

۴-سکوت دریا مولانا محمد رضوان عزیز۔

۵-ہزاروں مزاروں کی سرزمین۔

٦-ازبکستان امام بخاری اور امیر تیمور کا دیس۔

موسم کے بارے میں معلومات

جہاں جانا ہو وہاں کے موسم کے بارے میں بھی معلومات لینی ضروری ہے، خصوصا جن دنوں جانا ہو ان دنوں کا موسم ضرور معلوم کرے تاکہ اس کے لحاظ سے تیاری کی جاسکے، خصوصا ازبکستان کے بعض علاقے بہت ٹھنڈے اور بعض گرم ہیں، لیکن جو علاقے ٹھنڈے ہیں ان میں گرمی بھی شدت کی پڑتی ہے، جیسا کہ بخارا کے بارے میں ہمارے گائیڈ بھائی سنجار نے بتایا کہ اس میں سردی بھی بہت شدید ہوتی ہے اور گرمی بھی، اس لیے جب جانا ہو اس وقت کا موسم ضرور معلوم کرلیں، تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔

مشہور جگہوں کے بارے میں معلومات

جس ملک میں جانا ہو اس کے مشہور اور خصوصا تاریخی جگہوں کے بارے میں معلومات بہت ضروری ہیں، ایسا نہ ہو کہ انسان وقت نکال کر جائے بھی اور وہاں جاکر کچھ دیکھ بھی نہ سکے، اس لیے معلومات پہلے سے حاصل کرنا ضروری ہے، ذیل میں ہم ازبکستان کے شہروں کے بارے میں نقل کرتے ہیں ان میں مشہور اور تاریخی جگہوں کے بارے میں کچھ وضاحت اسی رسالے میں آچکی ہے اور کچھ کی مزید آنی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

یہ فہرست ازبکستان کے شہروں کی ہے، جو گوگل اور ویکیپیڈیا سے نقل کی جارہی ہیں:

١. افراسیاب آق قول

٢. اندیجان آنگرن، ازبکستان

٣. آساکا، ازبکستان بخت، ازبکستان

۴. بیک آباد بیرونی، ازبکستان

۵. بخارا چیمبای

۶. چیرچیق چارتاق

۷. دشت آباد دئناو

۸. فرغانہ گلستان، ازبکستان

۹. غوزار غجدوان

۱۰. خاکول آباد جیزخ

۱۱. جومہ، ازبکستان کتہ کورغان

۱۲. خیوا کاغان، ازبکستان

۱۳. خوقند کاسانسای

۱۴. قونغیرات مرغیلان

۱۵. ییناق نمنگان

۱۶. نوائی نوکوس

۱۷. نوروتا آہنگران

۱۸. آلمالیق آق تاش

۱۹. پسقند قرشی

۲۰. قاراکول قرہ سوو

۲۱. قووا قوواسوی

۲۲. ریشتان، ازبکستان سمرقند (سمرقند)

۲۳. شہر سبز شہری خان

۲۴. شیر آباد، ازبکستان شیرین

۲۵. سیر دریا تاشقند

۲۶. تاخیاتاش ترمذ

۲۷. تامدی بولاق توی تپہ

۲۸. تورتکول اوچ قورغان

۲۹. اوچ قدوق گرکانج

۳۰. اورگوت وابقند

۳۱. خان آباد خوجایلی

۳۲. ینگی آباد ینگیر

۳۳. ینگی یول زرافشان

کرنسی کے بارے میں معلومات

کرنسی کے بارے میں معلومات بھی بہت ضروری ہے؛ کیونکہ دوسرے ممالک میں ان کے اپنے ہی ملک کی کرنسی چلتی ہے، بسا اوقات جب کرنسی کے بارے میں معلومات نہ ہوں تو وہاں کے لوگ دھوکہ کھا بھی جاتے ہیں اور دھوکہ دے بھی دیتے ہیں، اس لیے معلومات حاصل کرنا بہت ضروری ہے، ازبکستان کا پیسہ (سوم) پاکستانی روپے سے بہت کم ہے، مثلاً آج کل پاکستان کا ایک روپیہ ازبکستان کے ۶۰ روپے کے برابر ہے، لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ چونکہ پاکستانی روپیہ کی چلت زیادہ نہیں اس لیے ازبکستان کے منی چینجر حضرات بھی اس سے زیادہ معاملہ نہیں کرتے، بلکہ ڈالر کا حساب رکھتے ہیں، لہٰذا اگر وہاں جانا ہو تو اپنے ساتھ پاکستانی کرنسی کے بجائے ڈالر لے کر جائیں، اور اس میں بھی یہ احتیاط ضروری ہے کہ ڈالر صاف ہوں اس لیے کہ وہ معمولی سی بھی کسی چیز کی وجہ سے ڈالر کو رد کر دیتے ہیں، کیونکہ اس وقت ایک ڈالر ان کے ۸۴۰۰ روپے کے برابر ہے، اس لیے ڈالر کے لا جانے میں خوب احتیاط کرنی چاہیے۔

بنیادی قوانین کی جانکاری

جس ملک میں جانا ہو اس کے موٹے موٹے قوانین کے بارے میں جانکاری ضروری ہے، مثلا ازبکستان کے بارے میں جانکاری ضروری ہے کہ وہاں پر سڑک کے قوانین کیا ہیں جن پر عملدرآمد ہوتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے قوانین سے ناواقفیت کی وجہ سے کوئی ایسا کام کرلیں جو ہمارے ملک پاکستان کی بدنامی کا ذریعہ بنے، اس لیے بنیادی معلومات حاصل کرلینا ضروری ہے۔

کھانے پینے کے بارے میں خصوصی احتیاط

کسی بھی ملک میں پائی جانے والی اشیاء خورد ونوش میں خصوصی احتیاط ضروری ہے؛ کیونکہ کھانے پینے میں اگر حلال کا اعتبار نہ کیا جائے گا تو قلبی ظلمتیں پیدا ہوتی ہیں جو انسان کے خیر سے دور جانے کا سبب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «لایدخل الجنة جسد غذی بالحرام»، جس جسم کو حرام کی غذا دی گئی ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔(۱)

اس لئے کھانے پینے میں احتیاط بہت زیادہ ضروری ہے، خصوصا وہ ممالک جو غیر مسلموں کے تسلط میں ہوں یا زیر اثر رہے ہوں اور تاحال متاثر ہوں، ان ممالک میں خصوصا ذبیحہ یا ان چیزوں کے استعمال سے بچنا چاہیے جن میں حرام کا شبہ ہو، ایسی صورت میں وہ کھانے استعمال کرنے چاہیے جن میں شبہ نہ ہو مثلا سبزیاں یا دیگر وہ اشیاء جن میں حرام کی ملاوٹ نہ ہو یا احتمال کم سے کم ہو۔

ازبکستان مسلمانوں کا ملک ہے، لیکن ستر سال روس کے زیر اثر رہا، اور اب بھی بہت سارے لوگ اس سے متاثر ہیں، جس کی وجہ سے سور وغیرہ کا گوشت بھی فروخت ہوتا ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ کھانے پینے میں معلومات حاصل کرلی جائے تاکہ حرام سے بچا جاسکے۔

---

(۱) المعجم الاوسط، برقم (۵۹۶۱)، ط/ دار الحرمین - قاہرہ

مواصلاتی نظام

ازبکستان میں مواصلاتی نظام بہت اچھا ہے، ان کے اندرون ملک بھی جہاز، بلٹ ٹرین، عام ٹرین، بسوں، کاروں کی سہولت موجود ہے، لیکن ان تمام چیزوں سے واقفیت بہت ضروری ہے، تاکہ صحیح جگہ اور وقت پر منزل مقصود پر پہنچ سکیں۔

موجود سہولیات

ازبکستان میں بھی عام دیگر ممالک کی طرح فون، انٹرنیٹ، اور اون لائن بینکنگ، اون لائن ہوٹلنگ سسٹم موجود ہے، جسے بوقت ضرورت استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن بہت زیادہ نہیں ہے، تاہم قدرے بہتر ہے۔

رہبر کی تلاش

سفر کے لیے گائیڈ (رہبر) کا ہونا بہت مفید ہے، کیونکہ بسا اوقات انسان کسی جگہ پر گذر بھی جاتا ہے، لیکن کوئی رہبر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہیں پاتا، لہذا بہتر یہ ہے کہ کسی کو رہبر بنالیا جائے جو وہاں کے بارے میں معلومات رکھتا ہو، البتہ یہ ضروری نہیں کہ رہبر کی بتائی ہوئی ہر بات درست بھی ہو؛ کیونکہ بسا اوقات انہیں بہت ساری باتوں کا علم نہیں ہوتا ہے، انہیں وہیں چیزیں بسا اوقات معلوم ہوتی ہیں جو ان کے معاشرے میں مشہور ہوں، یا ان کے بڑوں نے انہیں بتائی ہوں جو بسا اوقات دیومالائی قصے بن جایا کرتے ہیں، اور ان میں سچائی کم ہوتی ہے، اس لیے اگر کسی ایسی کمپنی کے ساتھ جایا جائے جن کے پاس پڑھے لکھے گائیڈ موجود ہوں جو صرف جگہوں کے بارے میں دیومالائی قصے نہ سنائیں بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی اس کے بارے میں حقائق سے واقف ہوں، ایسی صورت میں بہت ساری مشہور باتوں کے بارے میں بھی صحیح ترین بات سامنے آجاتی ہے۔

گروپ کے ساتھ ہونے کے فوائد

سفر میں ہر شخص کا مزاج الگ ہوتا ہے، کوئی یکسوئی کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہے تو کوئی مجمع کے ساتھ ہونے کو پسند کرتا ہے، کوئی دوسروں کی ترتیب کے تابع ہوتا ہے تو کوئی اپنی ترتیب سے ہی آزادی کے ساتھ سفر کرنے کو پسند کرتا ہے، علیحدہ سفر کرنے کے بھی فوائد ہیں اور یکجا مجمع کے ساتھ سفر کے بھی کچھ فوائد ہیں، ازبکستان کے سفر میں بندہ نے علماء کے مجمع کا جو فائدہ دیکھا اور محسوس کیا وہ درج ذیل ہے:

۱- علماء کے ساتھ ہونے سے سفر خود علمی جائزہ بن جایا کرتا ہے، مثلا تاریخ سے واقف علماء آپ کو بروقت بتاسکتے ہیں کہ یہاں فلاں واقعہ ہوا تھا، فلاں جنگ، فلان قصہ اس طرح ہوا تھا، جس سے آپ کی علمی ترقی ہوتی ہے۔

۲- علماء کی برکت سے انسان کو اس معاشرے کے لوگوں میں علم کی قدر و منزلت کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ یہاں کے لوگوں کا علماء کے ساتھ اور دین کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔

۳- بہت سے گناہوں سے انسان علماء کی وجہ سے ویسے ہی بچ جاتا ہے کہ ان کے لباس و وضع قطع کی وجہ سے ویسے بھی گناہ کرتے ہوئے انسان شرماتا ہے۔

۴- ان کی معیت سے قلب پر اچھے اثرات بھی پیدا ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے سفر سے واپسی کے بعد بھی ایک طرح سے اپنے کاموں میں دل جمعی میسر ہوتی ہے۔

۵- دوران سفر انسان کو اللہ والوں کی خدمت کا موقع بھی مل جاتا ہے، جو عام حالات میں شاید اس قدر میسر نہ ہو۔

۶- ان کے تعلق مع اللہ اور شب بیداری اور دین داری کو دیکھ کر اپنی زندگی کو بھی بسا اوقات سدھارنے کا موقع ملتا ہے۔

۷- رخصتوں پر عمل کرنے کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ کس رخصت پر کیسے اور کب عمل کرنا ہے۔

لیکن بسا اوقات ان کے ساتھ سفر کرنے سے انسان نقصان بھی اٹھا سکتا ہے اگر ان کے بارے میں برا

بھلا کہنا شروع کر دے یا پھر ان کی بے ادبی کر کے محروم ہو جائے۔

اس لیے اجتماعی سفر جس طرح فوائد کا باعث ہے ویسے ہی اس میں محرومی کا ڈر بھی ہے، البتہ اس میں اگر امیر اتنا باصلاحیت اور چست وچاق چوبند ہو جو پورے مجمع کو ساتھ لے کر چل سکے تو وہ سفر خیر ہی خیر ہے؛ کیونکہ کسی بھی سفر کے برکات میں اس کے امیر کا بڑا دخل ہے، اگر امیر اپنی فراست سے رفقاء سفر میں محبتوں کو ختم ہونے سے بچالے تو سفر مبارک ہو جاتا ہے اور اگر امیر ان کاموں سے ناواقف ہو تو ایسی صورت میں نہ صرف سفر بے برکت ہوتا ہے بلکہ انسان خود بھی اس سفر کے فوائد سے بہرمند نہیں ہو پاتا ہے، اس لیے ذیل میں امیر کی کچھ صفات کو ذکر کیا جاتا ہے، شاید کسی کو اس سے فائدہ پہنچے۔

امیر کی صفات

۱- امیر کے لئے برداشت والا ہونا ضروری ہے، جس شخص میں برداشت نہ ہو اس کے لیے امیر بننا مناسب نہیں، اس لیے کہ گروپ میں لوگوں کے مزاج بہت مختلف ہوتے ہیں اور جب طبیعت کے خلاف کام ہو تو انسان کو غصہ آتا ہے، اب اگر امیر غصہ ہی کرتا رہے تو پورے گروپ میں بے برکتی ہو جاتی ہے۔

۲- دوسروں سے زیادہ چست ہو، اگر امیر صرف خود کو بڑا سمجھ کر رفقاء کے ذمے کام ہی لگاتا رہے تو دل کے کسی گوشے میں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ امیر ہم پر اپنی امارت جھاڑ رہے ہیں، جس سے دلوں میں خلش پیدا ہوتی ہے اور بابرکت سفر بھی بے برکت ہو جاتا ہے۔

۳- کسی خاص فرد یا افراد کی طرف توجہ زیادہ نہ دے، کیونکہ دیگر بعض حضرات بھی اس سفر کے رفقاء ہوتے ہیں، وہ اس امتیازی حیثیت کو محسوس کر کے امیر سے متنفر ہو جائیں گے۔

۴- امیر کو صرف اپنے سامان کی نہیں بلکہ پورے رفقاء اور ان کے ساز و سامان کی فکر ہونی چاہیے، اس لیے کہ اگر امیر اپنی فکر کرے گا تو امارت کا فائدہ نہیں، اور یہ نہ سوچے کہ امیر بنالیا گیا تو مشکلات بڑھ گئی ہیں، اس لیے کہ جس طرح مشکلات بڑھی ہیں ویسے ہی فوائد بھی بڑھیں گے؛ کیونکہ:

ع "جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہیں"

سفر کے اسباب ودواعی

کسی بھی سفر کے لیے کچھ اسباب ودواعی ہوا کرتے ہیں، جن کی بنیاد پر انسان سفر کرتا ہے، کبھی تو غرض محض سفر ہی سفر ہوتا ہے، جس میں کوئی خاص دینی غرض وابستہ نہیں ہوتی، بلکہ محض اللہ تعالی کی بنائی ہوئی جگہوں اور نشانیوں کو دیکھنا مقصود ہوتا ہے دوسری کوئی غرض وابستہ نہیں ہوتی، لیکن بعض اسفار خالص عبادات کی غرض سے ہوتے ہیں، ان میں دنیاوی اغراض زیادہ نہیں ہوتے ہیں، جیسا کہ حرمین شریفین کا سفر اکثر اسی غرض سے کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض لوگوں کے اغراض اس کے علاوہ بھی ہوتے ہیں، بسا اوقات سفر اپنی تاریخ کے واقعات کو سامنے رکھ کر ان جگہوں کو دیکھنا ہوتا ہے جہاں سے بہت سی یادیں وابستہ ہوتی ہیں، اور یہ سفر اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرنے کا باعث بن جاتا ہے، اور اپنی غفلتوں کی وجہ سے دور ہونے کا اندازہ ہوجایا کرتا ہے۔

سفر ماوراء النہر کے اشتیاق کی وجہ

ماوراء النہر کے علاقے کی طرف سفر بھی کچھ ایسی ہی ہستیوں واقعات اور یادوں سے متعلق ہے جو انسان کتابوں میں پڑھتا، اور اساتذہ ومشائخ سے سنتا ہے، کیونکہ اسی ماوراء النہر میں ہمارے محدثین بھی تھے اور فقہاء بھی، علم کلام کے ائمہ بھی تھے تو تصوف کے مجددین وصوفیاء بھی، اسلام پھیلانے والے مجاہدین بھی تھے تو بڑے بڑے سائنس دان اور حکماء بھی۔

ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیشہ جب بھی کسی دینی، تاریخی یا اہل اللہ سے منسوب کسی جگہ کو دیکھنے کے لیے پابہ رکاب ہوں گے تو ایک سوال ہمیشہ گردش کرتا ہے کہ کیا حرمین شریفین کے علاوہ بھی کسی جگہ کے لیے سفر کیا جاسکتا ہے جو باعث اجر وثواب ہو؟ کیونکہ حدیث شریف میں تین مسجدوں کے علاوہ کسی جگہ کیلئے سفر کرنے کی ممانعت ہے۔

اس سلسلے میں بندہ دو قسم کی باتیں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے:

۱- ایک تو یہ تفصیل جاننی ضروری ہے کہ عبادات کی جگہوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے دو قسمیں ہیں:

الف: وہ عبادات جو مخصوص جگہوں اور مخصوص مقامات کے ساتھ خاص ہیں۔

ب: وہ عبادات جو کسی خاص جگہ کی طرف منسوب نہیں ہے، مثلاً نماز، روزہ، جہاد۔

۲- دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ؛ ایک ہے عبادت سمجھ کر سفر کرنا، ایک ہے نفس سفر کرنا، نفس سفر میں کسی کا اختلاف نہیں ورنہ تو تجارت وغیرہ دیگر اغراض کے لیے سفر کرنا بھی ناجائز ہو گا، اس حدیث میں نفس سفر کے بارے میں تذکرہ ہی نہیں ہے تو پھر اس غرض سے ذکر کیوں کیا جاتا ہے، یہ محض واہیات خیال ہے کہ اگر کوئی سوئزر لینڈ، امریکا، وغیرہ گھومنے جائے تو کوئی نہیں پوچھتا کہ شد رحال والی حدیث کی مخالفت ہو رہی ہے، لیکن جب اس قسم کی جگہوں پر جایا جائے جہاں اپنے مشائخ وائمہ کی یادگاریں ہوں تو فوراً ''شد رحال'' والی حدیث پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

رفقاء سفر

سفر میں انسان کے رفقاء مختلف ہوتے ہیں، بعض رفقاء نازک مزاج ہوتے ہیں، بعض بالکل ایسے نرم خو ونرم مزاج ہوتے ہیں جن کی اپنی کوئی بات گویا ہوتی ہی نہیں، بلکہ وہ ہر معاملہ میں آپ کی رائے کو لے لیتے ہیں جس سے بسا اوقات یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ تو کوئی رائے رکھتے ہی نہیں ہیں، اور بسا اوقات وہ صفت جو آپ کو اسفار میں جھگڑوں سے بچائے وہ دوسروں کی نظر میں عیب ہو جایا کرتی ہے، اس لیے سفر میں جانے سے پہلے ہی اللہ تبارک وتعالی سے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالی ایسے رفقاء نصیب فرمائیں جو بجائے دل کی کدورت کے دل کی راحت اور نشاط کا باعث وذریعہ ہوں اور آپ کو روحانی راحتوں کے ساتھ ساتھ جسمانی وقلبی راحتیں بھی نصیب ہوں، کیونکہ اچھے رفقاء اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس کے لیے باقاعدہ دعا بھی مانگی گئی ہے۔

ازبکی زبان کے کچھ ضروری الفاظ

اس زبان کے حروف تہجی لکھنے کی تو فی الحال ضرورت اس لئے نہیں کہ یہ خود ایک لمبا اور مستقل موضوع ہے، اور بندہ ان سے نابلد اور ناواقف ہے، یہاں چونکہ مقصد صرف ضروری الفاظ ہیں اس لئے ازبکی حروف تہجی کے بجائے ان الفاظ کو اردو زبان ہی میں لکھا جائے گا تاکہ اس کا استعمال آسان ہو، مثلا: خوش آمدید کے ازبکی ترجمہ ہے خوش کلپسس حالانکہ اس کے لکھنے کا انداز دوسرا ہے، لیکن اس طرح ان الفاظ کا سمجھنا اور استعمال کرنا ہمارے لئے آسان ہو گا، اس لئے اردو ہی میں لکھے جا رہے ہیں۔

نمبر شمار	اردو	ازبکی	نمبر شمار	اردو	ازبکی
۱.	خوش آمدید	خوش کلپسس	۳۱.	نو	توقز
۲.	السلام علیکم	السلام علیکم	۳۲.	دس	وون
۳.	پانی	ساو	۳۲.	بیس	یِگرمہ
۴.	کھانا	اوقات	۳۳.	تیس	ووتز
۵.	چائے	چائے	۳۴.	چالیس	چالسی
۶.	بسکٹ	پیچین	۳۵.	پچاس	خَرُخ
۷.	مسجد	مسجد	۳۶.	ساٹھ	اولمش
۸.	مزار	مزار	۳۷.	ستر	یدمش
۹.	دعا	نماز	۳۸.	اسی	سکسن
۱۰.	راستہ	یول	۳۹.	نوے	تخضن
۱۱.	دکان	دوکان	۴۰.	سو	یُز
۱۲.	موبائل بیلنس	بیلنس	۴۱.	ہزار	منگ

۱۳.	فون	ٹیلی فون	۴۲.	لاکھ	یُزمنگ
۱۴.	منی چینجر	پل الشترک	۴۳.	نوٹ	اکچا
۱۵.	ریلوے اسٹیشن	وَگزر	۴۴.	جوتے	کفش
۱۶.	بس اسٹاپ	افتوگزر	۴۵.	ٹوپی	توقی
۱۷.	کرایہ	اجارہ اولش	۴۶.	پھل	میوہ
۱۸.	آفس	آفس	۴۷.	ڈرائی فروٹ	کرغ میوہ
۱۹.	افسر	افتسر	۴۸.	اخروٹ	ہیمیوں
۲۰.	ائیرپورٹ	ائیرپورٹ	۴۹.	کوٹ	پلاٹو
۲۱.	گنتی	حساب لش	۵۰.	جبہ	جاؤ
۲۲.	ایک	بِر	۵۱.	لباس	لباسلر
۲۳.	دو	اکی	۵۲.	ڈاکٹر	طبی
۲۴.	تین	اوچ	۵۳.	دواخانہ	ابتیکا
۲۵.	چار	تورت	۵۴.	ہسپتال	بلنیسہ
۲۶.	پانچ	بیش	۵۵.	تھیلی	سلفن
۲۷.	چھ	اولتے	۵۶.	بیت الخلا	توئیلت
۲۸.	سات	یتی	۵۷.	ہوٹل	مہمان خانہ
۲۹.	آٹھ	ساکز	۵۸.	ریسٹورینٹ	ریستوران
۳۰.	شہر	شہر	۵۹.	ملک	دولت

سفر ازبکستان کا آغاز

ان مختصر معروضات کے بعد اب سفر نامہ کا آغاز کرتے ہیں جس میں سعادت کی بہت ساری وجوہات جمع

تھیں، جو صرف محدثین کے دیس میں جانے کی خوشی، وہاں کی بود و باش کو دیکھنے کا موقع ہی تھا، بلکہ اپنے محبوب ترین استاد، ناقد عصر حضرت مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ (۱) کے ساتھ ہم رکابی تھی، اور ساتھ میں مشائخ پاکستان میں سے مختلف مشائخ کے ساتھ ہونے کی بھی سعادت تھی، جس میں تقریبا سینتالیس (۴۷) افراد تھے، جن میں سے تینتالیس (۴۳) علماء تھے اور باقی علماء سے محبت و تعلق رکھنے والے احباب۔

سفر بخارا و سمرقند

لاہور سے ہماری فلائٹ صبح ساڑھے دس بجے تھی ساڑھے سات بجے ہمیں ائیر پورٹ پہنچنا تھا، ہم صبح سات بجے مولانا عابد صاحب کے ہاں "صفہ اکیڈمی" سے مولانا نعیم الدین صاحب کے بیٹے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے لاہور سے روانگی کے وقت چونکہ ویزہ سب کا ایک ہی پاسپورٹ پر لگا تھا اس لئے سب یکجا ائیر پورٹ پر جمع ہوئے اور اس کے بعد ایک ساتھ ائیر پورٹ کے اندر گئے، بندہ استاد محترم مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ لاہور ائیر پورٹ میں اندر داخل ہوا، برادران گرامی مولانا یاسر عبد اللہ صاحب اور مولانا عمران ممتاز صاحب نے سامان اٹھایا اور ائیر پورٹ میں اندر آگئے، ایک ساتھ ۴۷ افراد کا جانا جن میں

---

(۱) سطور بالا کے چھپنے سے پہلے ہی استاد محترم (بتاریخ ۲۴/ صفر/ ۱۴۴۲ھ بمطابق ۱۲/ اکتوبر/ ۲۰۲۰ء بروزِ پیر بعد نماز ظہر بعمر ۹۵ سال) دنیا کو داغ مفارقت دے کر اپنے اصلی سفر آخرت کی طرف روانہ ہو چکے ہیں، یہ سفر نامہ روزانہ کی بنیاد پر استاد محترم کو سنایا بھی اور استاد محترم کا بہت زیادہ اصرار کے ساتھ یہ حکم تھا کہ اسے چھپوایا جائے، لیکن ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، باوجود چاہت کے بھی استاد محترم کی زندگی میں نہ چھپ سکا، اور استاد محترم دنیا سے رخصت ہو گئے، جس کی حسرت بندے کو تادم آخر رہے گی لیکن شاعر کا وہ شعر یقینا برحق و سچ ہے کہ:

ماكل ما يتمنى المرء يدركه تجري الرياح بما لا تشتهي السفن

اور: ع وكم حسرات في بطون المقابر

اس سفر نامہ کے بعض مواقع پر استاد محترم خوب روئے بھی اور جھوم جھوم کر داد بھی دیتے رہے، لیکن بار بار یہ اصرار رہتا تھا کہ "میاں اسے جلدی چھاپو"، یہ آواز نہ جانے کتنی بار سن چکا تھا کہ "میاں سفر نامے کا کیا کیا؟ کب چھاپ رہے ہو"، اور نہ صرف یہ کہ اس کے بارے میں پوچھنے پر اکتفاء کیا ہو بلکہ طلبہ کے سامنے بھی تذکرہ فرمایا کرتے تھے کہ ان کا سفر نامہ چھپ جائے تو بہت اچھا ہو، لیکن افسوس اس کی طباعت استاجی نہ دیکھ سکے، اللہ تعالی اسے حضرت استاد محترم کے لئے ہدیہ وتحفہ بنادے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین

سے ہر آدمی داڑھی ٹوپی والا ہو اور تقریبا ۴۲ یا ۴۳ کے قریب علماء ہوں ایسی صورت میں آگے نکلنا آسان کام نہیں؛ کیونکہ ہر ایک ہی قابل احترام اور لائق تعظیم ہے، لیکن پھر بھی استاد محترم کے ہاتھ میں چونکہ بندہ نے اپنا ہاتھ رکھ رکھا تھا اس لئے ہم سے پہلے والے وہ افراد جنہوں نے استاد محترم کو دیکھ لیا تھا انہوں نے جگہ چھوڑی اور ہم ازبک ایئر لائن کے کاؤنٹر کے سامنے پہنچ گئے، استاد محترم کرسی پر بیٹھ گئے اور ہم تینوں سامان جمع کرانے کے لئے کھڑے ہوگئے، علماء کا اتنا بڑا مجمع، لوگ تو دو تین علماء کو یکجا دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں، کچھ کو تو مولوی فوبیا کی بیماری بھی ہوتی ہے، لیکن واقعۃً علماء کا اس طرح جمع ہونا ایک پر کیف صورت اختیار کر گیا تھا۔

ازبک ایئر لائن چونکہ ہفتہ میں ایک مرتبہ پاکستان آتی ہے اس لئے وہ پی آئی اے کے کاؤنٹر کو استعمال کر رہے تھے، اور سامان کا حال یہ تھا کہ اسے خود لے جاکر رکھنا پڑ رہا تھا، پی آئی اے کی انتظامیہ کے ایک فرد سے معلوم ہوا کہ یہ جاپانی مشین ہے اور تقریبا ڈیڑھ سال سے خراب پڑی ہے۔

ادھر ایک عجب سماں بنا ہوا تھا، بنچ پر استاد محترم مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب، مولانا مفتی حسن صاحب، مولانا قاضی ارشد الحسینی صاحب، مولانا شیر جان صاحب اور دیگر علماء یکجا آبیٹھے، استاد محترم مفتی حسن صاحب سے محو گفتگو تھے اور دیگر حضرات بھی ساتھ محظوظ ہو رہے تھے۔

اللہ اللہ کر کے سامان جہاز کے لئے جمع ہو گیا اور اب ہم ایمیگریشن کے مراحل سے گزر کر لاؤنج میں آبیٹھے تھے۔

فلائٹ ساڑھے دس بجے تھی اور ہم جہاز کے انتظار میں زیادہ دیر نہیں بیٹھے تھے کہ جہاز میں جانے کا وقت پورا ہو گیا اور ہم جہاز کے لئے روانہ ہوگئے، استاد محترم کو جہاز کے عملے نے وہیل چیر پر جہاز تک پہنچایا اور وہاں سے استاجی کو جہاز میں سوار کروا دیا گیا، استاد محترم کھڑکھی کی طرف ان کے ساتھ مولانا یاسر صاحب اور ان کے ساتھ بندہ بیٹھا تھا، استاد محترم کی ظرافت بھری باتیں سن کر رستہ بھر خوب محظوظ ہوئے۔

ازبک ایئر لائن کا جہاز چھوٹا تھا، عملہ کاروباری اور رائج الوقت اخلاقیات سے بھرپور تھا (یہ تعبیر اس لیے کہ اس وقت تک خیال یہی تھا، آگے ان کے اخلاقیات کے بارے میں مزید تفصیل سے ذکر کیا جائے گا)، کھانا ائیر بلیو کا تھا، لیکن عمدہ بہت تھا، نظم وضبط کچھ زیادہ عمدہ معلوم نہیں ہو رہا تھا، جہاز وقت سے چند منٹ دیر سے بھی اڑا، لیکن مجموعی طور پر انتظام اچھا معلوم ہو رہا تھا، جہاز روانہ ہوا کچھ دیر میں کھانا آیا عمدہ کھانا تھا خوب کھایا

اور یوں ازبک ائیر لائن سے سفر طے کیا، راستہ میں جب ازبکستان شروع ہو چکا تو جہاز سے برفانی پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آیا، کہیں پر مسلسل کہیں پر تھوڑے سے فاصلے کے ساتھ برف ہی برف نظر آرہی تھی، جس نے پہاڑوں کی مٹی کو بہت خوبصورت سفید چادروں سے ڈھک رکھا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پردوں کو سلوٹیں دے کر لٹکایا گیا ہو۔

جہاز افغانستان سے ہوتا ہوا تاشقند ائیر پورٹ پر پہنچا، جہاز سے اتر کر بس میں سوار ہوئے تو ایک پروٹوکول افسر بھی ساتھ میں موجود تھا، بس میں بٹھا کر انہوں نے ہم سے سامان کے ٹیگ مانگے، ہم نے ٹیگ دے دیئے، اسی بس میں مولانا ادریس صاحب پشاور والے اپنے دو ساتھیوں سمیت سوار تھے، ان سے بھی ٹیگ مانگے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم الگ آئے ہیں، اس پر انہوں نے ادبا عرض کیا کہ ہم آپ کو دوسری جگہ اتاریں گے کیوں کہ ہمیں صرف سینتالیس افراد کا کہا گیا ہے، آپ سے معذرت چاہتے ہیں، اس طرح انہیں اکانمی جگہ میں اتارا اور ہمیں وی آئی پی لاؤنج میں پہنچایا، جہاں پر ایمیگریشن کا مرحلہ بھی بہت آسانی سے حل ہوا، ہم سامان کے انتظار میں تھے اور بہت آرام دہ صوفوں پر صرف مولوی ہی مولوی نظر آرہے تھے۔

سامان آنے کے بعد جب ائیر پورٹ کے وی آئی پی لاؤنج سے باہر نکلے تو استقبال کے لئے ازبک حکومت کی طرف سے پروٹوکول پر مامور کچھ افراد اور اس پروگرام کو ترتیب دینے والے "حامد صاحب" پہلے سے وہیں پر موجود تھے، تاشقند میں موسم کچھ سرد تھا وہاں کے لوگ تو جیکٹیں پہنے ہوئے تھے، ہم بعض ساتھیوں نے فی الحال سردی کا سامان ابھی نہیں نکالا تھا، ہلکی ہلکی سردی (اپنے حساب سے کہہ رہا ہوں کیوں کہ سردی بندہ کو یوں ہی ہلکی محسوس ہو رہی تھی موسمیات کی رپورٹ کے لحاظ سے تو سردی زیادہ تھی)، بنچ اور کرسی کی ٹھنڈک، ازبک ائیر پورٹ کی صفائی ستھرائی سب مل کر ایک عجب خوبصورت منظر تھا، قاری شیر محمد صاحب نے استاد محترم کو ایک بنچ پر بیٹھنے کی درخواست کی، لیکن ساتھ میں بندہ سے فرمایا کہ بینچ پر کچھ نیچے بچھا دینا کیونکہ جگہ ٹھنڈی ہے، بندہ نے استاد جی سے عرض کیا تو فرمانے لگے کہ بیٹھنے کی کیا ضرورت ٹہلتے رہیں گے، پھر ائیر پورٹ میں ٹہلتے رہے اتنی دیر میں سب ساتھی بس میں سوار ہونے لگے استاد محترم بھی بس میں سوار ہو گئے اور ہم یوں ازبکستان پہنچ کر گویا اب سیر تاشقند میں مصروف ہو گئے۔

بس میں ہمارے ساتھ حامد صاحب[1] جو اس گروپ کی ترتیب بنانے والے ادارے کے تھے، ساتھ میں ہمارے ازبک گائیڈ "بھائی سنجار"[2] صاحب تھے۔ تاریخ سے بھی واقفیت کچھ کچھ رکھتے تھے، خصوصا ان کے شعبہ سیاحت سے متعلق معلومات حاصل کرر کھی تھیں، اگر چہ اس میں رطب ویابس دونوں طرح کی چیزیں ہوا کرتی تھیں، لیکن بات بہت سلیقے سے کیا کرتے تھے، مجمع کو چلانا خصوصا جہاں ادب کا خیال بھی رکھنا ہو ایک مشکل ترین مرحلہ ہے، پھر کسی کا کوئی چبتا ہوا جملہ جب بہت خیال رکھنے کے بعد بھی سامنے آئے تو انسان بہت چڑ چڑا سا ہو جاتا ہے، اسے غصہ ہوتے ہوئے تو دیکھا، لیکن چڑ چڑا پن اس میں نہیں دیکھا، مجمع شائستگی سے لے کر چلے، ان کی محبت بھری آواز جس میں وہ اپنی مخصوص اردو میں بار بار ایک جملہ کہتے رہتے تھے "سو ڈیئر گیسٹ اب ہم ایک موزولیم دیکھنے جارہے ہیں" ابھی بھی یاد ہے۔

کئی جگہوں پر اسے دیکھا کہ تاویل اتنی عمدہ کی جیسے کوئی انتہائی سمجھدار عالم وفاضل ہو، مثلا: قثم ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مزار پر چڑھنے کے لئے کافی سیڑھیاں ہیں اور وہاں کے عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ جو

---

(۱) بھائی حامد صاحب لاہور کے رہنے والے کوٹ پینٹ میں ملبوس، اٹھائیس سال سے ازبکستان میں ہیں، ازبکی زبان نہیں جانتے لیکن رشین زبان خوب جانتے ہیں؛ کیونکہ رشین زبان ان تمام ممالک میں بولی جاتی ہے جو سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے سبب آزاد ہوئے، اس لئے ان کے بقول رشین سیکھنے سے تمام ریاستوں میں بولنا آسان ہو جاتا ہے، گفتگو بڑے ہی دھیمے سے لہجے میں کرتے ہیں، ان سے گفتگو کرتے ہوئے ایسا لگ رہا ہوتا تھا کہ ان کے خون میں ابھار ہی نہیں، طبعیت میں بڑا ٹھہراؤ نظر آتا تھا، لیکن چونکہ وہ ہمارے ساتھ بہت مختصر وقت رہے، اس لئے کوئی فیصلہ کرنا تو مشکل، اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں جتنی دیر وہ ہمارے ساتھ رہے بہت تواضع اور ملنساری سے، بہت ہی خوش مزاجی سے ملے، ان سے جو بات پوچھی جاتی بہت ٹھہراؤ کے ساتھ اس کا جواب دیتے، ہمارے سفر کی پوری ترتیب انہوں نے اور ان کی ٹیم نے ہی بنا رکھی تھی، وہ اور ان کا گروپ بڑی چابکدستی سے ہمارے سفر میں سہولیات کا انتظام کرتا رہا، ان کے بقول وہ وی آئی پی گروپس کے لئے خود آتے ہیں باقی گروپوں کو ان کا عملہ ہی دیکھتا ہے۔ وہ بتانے لگے کہ ۲۸ سال سے اس ملک میں ہوں ان کے مختلف حضرات سے واقفیت ہے یہاں تک کہ ان کے پریزیڈنٹ تک سے رابطہ ہے، انہوں نے اپنے روابط کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمیں سہولیات پہنچانے کی بہت کوشش کی اور ہمیں کافی سہولیات پہنچائی بھی ہیں۔

(۲) بخارا کے باشندے، فغنہ کے رہنے والے تھے، بخارا کا علاقہ فغنہ ان کا گاؤں تھا، لیکن رہائش والدہ اور بیوی بچوں سمیت تاشقند میں تھی، گھٹا ہوا بدن، گوری رنگت کے مالک تھے، ایک دانت سونے کا لگا رکھا تھا، اردو میں ایم اے کیا تھا، اردو چونکہ ہندوستانی استاد سے سیکھی تھی اس لئے اردو میں ہندی جملے ساتھ ساتھ ملاتے رہتے تھے، لیکن ذہانت اور فن میں آگے بڑھنے کے شوق کی وجہ سے کہنے لگے کہ میں نے ایم اے اردو کیا ہے، دو سال اردو کو سیکھا ہے، لیکن اب میں مستقل نہیں سیکھتا بلکہ آپ اردو بولنے والے حضرات سے خود سیکھتا ہوں۔

اوپر چڑھتے ہوئے سیڑھیاں گنے اور واپسی میں بھی گنے اور دونوں صورتوں میں تعداد برابر ہو تو اس آدمی کی مغفرت ہو جاتی ہے"، ساتھیوں نے از راہ تفنن سنجار سے اس بارے میں پوچھ لیا کہ کیا ایسا ہوتا ہے تو سنجار نے کہا یہ بات شاید اس لیے کی ہو گی کہ اس مزار تک جانے کے لیے چونکہ سیڑھیاں زیادہ ہیں لوگ اس سے گھبراتے تو کسی نے مغفرت کا کہہ دیا ہو گا تا کہ سیڑھیاں اس ارادے سے گنتا رہے تو تعداد کی زیادتی سے اس کا ذہن ہٹ جائے گا اور آسانی سے اوپر تک چڑھ جائے گا۔

اس قسم کی کئی باتیں سنجار سے سننے کو ملی جس سے معلوم ہوا کہ سیاحت چمکانے کے لئے ہر قسم کی باتیں کرنے کا شوقین نہیں تھا، بلکہ اپنے تئیں صحیح بات بتانے کی پوری کوشش بھی کرتا تھا، ایک مرتبہ تو یہ بھی کہا کہ میں کچھ باتیں کرلیتا ہوں، آپ حضرات کو علم ہے ان باتوں کا اگر کوئی بات میں غلط کر رہا ہوں تو آپ لوگ میرے اصلاح کرلینا۔

جوابات بھی برجستہ دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ کہنے لگے کہ کسی پاکستانی نے مجھ سے کہا کہ تم لوگ اتنی سردی میں آئسکریم کیوں کھاتے ہو؟ میں نے کہا کہ تم پاکستانی اتنی گرمی میں چائے کیوں پیتے ہو؟ جیسے تمہیں گرمی میں چائے پینے میں دشواری نہیں ہوتی اسی طرح ہمیں سردی میں آئسکریم کھانے میں بھی دقت نہیں ہوتی ہے، جس طرح ہم تم پر اعتراض نہیں کرتے تم بھی ہم پر اعتراض نہ کرو۔

تاشقند کی سیر

سب سے پہلے بس تاشقند شہر (جس کا پرانا نام "شاش" ہے) کی ایک تاریخی مسجد "مسجد حضرت امام" پہنچے، جہاں ہم نے ظہر کی نماز ادا کرنی تھی، کیونکہ جمعہ کی جماعتیں ہو چکی تھیں ہم "مسجد حضرت امام" پہنچے قدیم طرز کی بنی ہوئی یہ مسجد آج بھی اپنی فن تعمیر کا داد لیے بغیر نہیں رہتی، پر شکوہ عمارت پتھروں سے مزین کی گئی دیواریں، فرش پر لگی اینٹیں فن کی شاہکاری کا منہ بولتا ثبوت تھی، اس پر مستزاد اس کی صفائی اور لوگوں کا اپنے اس ورثہ کو سنبھالنا اس کا خیال رکھنا دیدنی تھا۔

مسجد کا وضو خانہ اور بیت الخلاء:

ابھی تک ہم ائیر پورٹ اور پھر بس میں تھے اس لیے ہمیں یہاں کے لوگوں سے کوئی خاص میل جول نہ ہوا تھا، یہاں کے لوگوں کے بود و باش ان کی صفائی ستھرائی کا اندازہ نہیں تھا، اب مسجد حضرت امام پہنچ کر پہلا موقع تھا جب ہم یہاں کے لوگوں سے آشنا ہوئے، ان کی طرز زندگی دیکھی، ان کی صفائی ستھرائی دیکھنے کو ملی۔

چنانچہ جب ہم وضو خانے اور بیت الخلا کی عمارت میں پہنچے تو ہمیں بہت ساری نئ چیزیں دیکھنے کو ملیں مثلا:

۱: ان کے نفاست سے بنے ہوئے بیت الخلا

۲: ان کی شائستگی سے بنے وضو خانے

۳: ان کے ہاتھ پاؤں پوچنے کے لئے رکھے ہوئے دستی تولیے

۴: ان کا ہاتھ کے لئے الگ اور پاؤں کے لئے الگ الگ تولیے رکھنا

۵: ان کا کوٹ وغیرہ لٹکانے کے لئے مستقل جگہوں کا بنانا

۶: ان کے ایک فرد کا مستقل تولیوں کی صفائی پر مامور ہونا

۷: صفائی کے لیے مامور افراد کا صاف ستھرا ہونا

۸: ان کا بیسن میں پاؤں دھونے کو برا سمجھنا

۹: تولیوں پر رنگت یا نشان کے فرق سے ہاتھ پاؤں کی وضاحت کرنا اور تولیوں کے لئے الگ الگ ٹوکریوں کا رکھنا

۱۰: ان کا وضو کے لیے اونچی اونچی جگہیں بنانا

۱۱۔ ان کا مہمان کی موجودگی میں خود آگے نہ بڑھنا، بلکہ مہمان کو مقدم کرنا

۱۲۔ ان کا مہمان کے لیے لوٹے میں پانی بھر کر بیت الخلا کے قریب تک پہنچانا

۱۳۔ ہر وضو خانے اور مسجد کے باہر جوتے پہننے کے لئے شاورن (سکوپ) کا رکھا رہنا

یہ ساری وہ باتیں ہیں جو ان کے وضو خانوں اور بیت الخلا میں ہم نے دیکھی ہے، اس لئے کہ سعودی، متحدہ عرب امارات جیسے ممالک کے لوگوں کے وضو خانے اور بیت الخلا دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے، لیکن یہاں کے لوگوں کی صفائی اور ہر چیز کو مرتب کرنے کا نظم دیکھ کر واقعۃ ان کی صفائی ستھرائی کی داد دینی پڑتی ہے۔

یہاں وضو خانے میں مفتی حسن صاحب دامت برکاتہم کو دیکھا کہ ایک دھوتی پہنے ہوئے تھے اور ایک تھیلی میں الگ سے دھوتی رکھتے تھے، جب نماز کا وقت ہوتا تو دھوتی بدل دیتے اور نماز کے بعد دوسری دھوتی پہن لیتے، اس میں حضرت کا کمال احتیاط تھا یا پھر کوئی مجبوری، لیکن دیکھنے اور سیکھنے کی جو چیز مجھ ناکارہ کے لئے تھی وہ یہ تھی کہ زندگی بے تکلف، جس کام کے کرنے کا ارادہ کرلیں اور وہ کام شرعاً جائز ہو تو اس کے کرنے میں نہ کوئی چیز ان کے لئے رکاوٹ بنی اور نہ تکلفات، فوراً تھیلی نکالی بندہ سے پوچھا نماز کا وقت باقی ہے، بندہ نے بتایا کہ وقت کم ہے کوئی بیت الخلا خالی نہ تھا، فرمانے لگے یہ چادر ذرا پکڑلیں مجھے کپڑے بدلنے ہیں، فوراً تھیلی سے دھوتی نکالی اور بدل دی، پھر وضو فرما کر نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے۔

استاد محترم مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ ہمیشہ کی طرح اس سفر میں بھی دوسروں کی تکلیف سے خود کو ہر وقت بچاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ کوئی جوتا اتارتا یا ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا تو منع فرماتے، جب اصرار کرتا تو یہی فرماتے: ”ارے حضرت آپ کیوں زحمت کرتے ہیں“ بندہ کے ساتھ بھی کئی مرتبہ ایسا معاملہ ہوچکا ہے، لیکن سفر میں چونکہ بندہ تھا ہی استاد محترم کی خدمت کے لئے اس لئے سفر میں بندہ کو یا مولانا یاسر صاحب کو بلا کر کسی بھی کام کا کہہ دیتے تھے، وضو کرنے میں استاد محترم کو دشواری یوں ہوتی کہ نیچے بیٹھنا مشکل تھا، لیکن ازبکستان کی مساجد میں چونکہ جگہیں اونچی بنی ہوئی تھیں، اس لیے وضو کرنے میں دشواری نہ تھی، خود وضو فرماتے تھے، خود ہی اٹھتے تھے، استاد محترم کو جب بھی وضو کرتے ہوئے دیکھا مولانا عادل صاحب دامت برکاتہم کے ایک جملے کی وجہ سے خصوصی توجہ سے دیکھتا کہ انہوں نے فرمایا: ”نماز و وضو کا اہتمام دیکھنا ہو تو مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہ کا وضو دیکھو، کتنے اہتمام سے سر کا اور کانوں کا مسح کرتے ہیں“، یقیناً صرف مسح ہی نہیں استاد محترم کو وضو کے ہر رکن میں اہتمام کرتے ہوئے ہی پایا، یہاں تک کہ کبھی اگر مجبوراً پاؤں پر پانی ڈالنے کی ضرورت پڑتی تو پانی انگلیوں میں پہنچ جانے کے باوجود فرماتے بھئی انگلیوں میں پانی صحیح طرح سے پہنچادو، جب ہم دوبارہ ڈالتے تو اطمینان ہوتا اور پھر بھی ازراہ تلطف فرماتے: ”ہمیں کیا تم مفتی ہو جیسا کہوگے ہم تو ویسا ہی کریں گے“۔

ہم اپنے ساتھ وہیل چیئر بھی لے گئے تھے تاکہ استاد محترم کو زیادہ چلنا نہ پڑے، لیکن استاد محترم وہیل چیئر پر بیٹھنے کے لیے تیار ہی نہ تھے، اس لیے پیدل چلتے تھے، مسجد وضو خانے اور پھر دیگر جگہوں میں بھی کافی

فاصلہ تھا، لیکن استاد محترم سب جگہوں پر پیدل چلے جایا کرتے تھے، اگرچہ جانے میں تیزی نہ ہو سکتی تھی کیوں کہ استاد جی کے چلنے میں خیال رکھنا ضروری تھا، لیکن اس کے باوجود استاد جی جلدی جلدی چلتے تھے تا کہ گروپ کے باقی ساتھیوں کو تکلیف نہ ہو، سب سے پہلے ہم نے نماز ظہر ادا کی، ابھی ہم مسجد سے نکلے نہیں تھے کہ ایک ساتھی نے کہا کہ عصر کا وقت ہونے والا ہے اگر ہم وہ بھی پڑھ لیں تو استاجی کے لئے آسانی ہو جائے گی، بندہ نے استاجی سے تذکرہ کیا کہ عصر کا وقت ہونے والا ہے پڑھ لیتے ہیں استاد جی نے حامی بھری اور ہم نے عصر کی نماز پڑھ لی، بتانے والے چونکہ خود عالم تھے اس لیے بندہ نے زیادہ تحقیق نہ کی بلکہ سب ساتھی جن کی تعداد تقریبا دس سے زیادہ تھی ہم نے عصر کی نماز بھی ایک ساتھ ادا کرلی۔

جہاں ہم ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے اترے تھے وہ ایک بڑا احاطہ تھا جس میں چھ چیزیں تھیں:

۱۔ مسجد حضرت امام ۲۔ مصحف عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۳۔ معہد الامام البخاری ۴۔ مزار امام ابو بکر قفال شاشی ۵۔ مدرسہ۔ ۶۔ مکتبہ الامام البخاری

۱۔ مسجد حضرت امام

یہ ایک وسیع اور کشادہ مسجد ہے، جسے بہت خوبصورتی سے بنایا گیا ہے، نیچے وضو خانہ ہے جو مسجد سے باہر کی طرف ہے، وضو خانے سے نکل کر مسجد کی طرف جاتے ہوئے آٹھ دس سیڑھیاں ہیں، جس سے اوپر کی طرف چڑھ کر مسجد میں داخل ہوا جاتا ہے، مسجد کو بہت منقش انداز سے بنایا گیا ہے، خصوصا مسجد کے اندر کے حصہ میں بہت ہی خوبصورت نقش و نگار کیا گیا، ظاہری آرائش و زیبائش سے مزین یہ مسجد اپنے معمار اور اس وقت کی حکومت کی دینی معاملات میں دلچسپی کی ایک واضح دلیل ہے۔

مسجد فی الحال وہاں کے لوگوں میں مسجد حضرت امام کے نام سے مشہور ہے، بعض لوگوں سے "ہست امام" نام بھی سنا، بڑی مسجد ہے جس میں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے اور بہت عمدہ بنائی گئی ہے۔

باقی ساتھی نماز ظہر سے جلدی فارغ ہو کر مصحف عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ دیکھنے کے لئے اس کی عمارت کے پاس پہنچ چکے تھے اور ہمارا انتظار ہو رہا تھا ہم بھی وہاں پہنچ گئے وہاں کچھ مصر وغیرہ کے پڑھے ہوئے

علماء بھی ملے اور وہ مصحف عثمان بن عفان اور دیگر جگہوں کے بارے میں بتلا رہے تھے۔ یہ چند جگہیں بہت قریب قریب تھیں، مدرسہ، مصحف عثمانی وغیرہ کا قرب دیکھ کر یہ ذہن میں آتا تھا کہ اتنے قریب یہ کیسے ہو سکتا ہے، ایسے گویا کسی ایک ہی میدان میں یہ چیزیں بنالی گئی ہوں، لیکن ظاہر ہے ایسا تو ہوا نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس وقت کے چھوٹے مکانات، چھوٹی چھوٹی گلیوں کے اعتبار سے یہ جگہ الگ الگ ہی صحیح قریب تو ضرور تھیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی یہاں کے باشندے کتنے علم دوست اور محبان دین تھے۔

۲- مصحف عثمان بن عفان:

یہ مصحف امیر تیمور (تیمور لنگ) یہاں بغداد کی فتح کے بعد لے کر آئے تھے، جو تیمور کے خاندان کی ملکیت میں رہا، روسیوں نے یہاں سے مقدس نوادرات کو منتقل کر دیا تھا، لیکن ازبک قوم نے اس نسخے کو حجرہ ہست امام میں چھپا کر اس کے سامنے دیوار بنوا کر اس کی حفاظت کی، ازبکستان کی آزادی کے بعد ۱۹۹۱ء میں یہ نسخہ سامنے لایا گیا۔

مصحف عثمانی سے مراد یہاں کے لوگوں کے بقول وہ مصحف ہے "جس میں تلاوت قرآن کریم کرتے ہوئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے"، یہ بھی ایک خوبصورت عمارت میں رکھا گیا ہے، جہاں پر فقط مصحف عثمان رضی اللہ عنہ ہی نہیں بلکہ دیگر مخطوطات بھی ہیں، جس میں تفاسیر، کتب فقہ، تصوف اور دیگر اچھے اور قدیم قلمی نسخے رکھیں ہیں، ایک کمرے میں تو صرف مصاحف اور ترجمہائے قرآنیہ مختلف زبانوں میں رکھی ہوئی تھی، باقی میں مختلف کتابیں تھیں، مصحف عثمانی کو دیکھ کر ایک ہیبت سی طاری تھی، ایک عظمت تھی جس کی بناء پر ایک طرح کے دبدبہ میں مبتلا تھا، اس نسخے پر خون کے دھبے بھی ہیں، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، اسے ایک شیشے میں بند کیا گیا ہے، نہ اسے ہاتھ لگانے کی اجازت ہے اور نہ اس کی تصویر لینے کی اجازت ہے، اگرچہ اس نسخے کا فوٹو ترکی نے چھاپہ ہے، لیکن اس اصل نسخے کی تصویر لینے کی اجازت نہیں اس کی ایک اور کاپی اسی کے ساتھ رکھی ہے، اس کی تصویر لے سکتے ہیں، اس عمارت کے دوسرے مخطوطات کی تصویر بھی لے سکتے ہیں، صرف اس نسخے کی تصویر لینے کی اجازت نہیں، کیونکہ شعاؤں سے اس نسخے

کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے اس کی تصویر سازی ممنوع ہے۔

۳- مدرسہ۔۔۔

مصحف عثمانی دیکھ کر جب ہم باہر نکلے تو قریب ہی ایک اور عمارت تھی، جس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ کسی زمانے میں مدرسہ تھا، روسی استعمار میں بہت سارے مدارس ویران ہوئے جن میں ایک یہ مدرسہ بھی تھا، ابھی بھی وہاں مدرسہ نہیں، بلکہ اس کے کمرے اس کا ہال وغیرہ اسی طرح کا ہے، البتہ اب اس میں مدرسہ نہیں، بلکہ تجارت اور ثقافتی چیزیں سیاحوں کے لئے رکھی ہیں جو کافی مہنگی بیچی جاتی ہیں۔

یہاں جو چیزیں دیکھنے کو ملیں وہ ان کی دست کاری ہے، جس طرح ہمارے ہاں سندھ، پنجاب وغیرہ میں دست کاری بہت زیادہ تھی، اسی طرح ازبکستان میں بھی دست کاری کا فن بہت زیادہ اور بہت نفیس ہے، ان کے ہاتھوں کے بنے برتنوں کی سجاوٹ کسی دلہن سے کم نہیں ہوتی، ان کے کاریگر کے ہاتھ کی صفائی دیکھ کر واقعۃً لگتا ہے کہ ہنر مندی اس قوم میں بہت ہی زیادہ ہے۔

لیکن خریدی کوئی چیز نہیں کیونکہ ایک جملہ جو ہم بار بار سن رہے تھے کہ ایک دن ہمیں خریداری کے لیے دیا جائے گا، اس لیے کہ ایک تصور تھا کہ سیاحتی مقامات میں چیزیں مہنگی ملا کرتی ہیں، اس لیے چھوڑ دی کہ بازار سے خریدیں گے، لیکن اسے بعد میں اپنی ناتجربہ کاری ہی سمجھی؛ کیونکہ بعد میں خریدنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔

۴- مزار امام ابو بکر قفال شاشی رحمہ اللہ

اس جگہ سے نکل کر ہم قریب ہی میں موجود امام ابو بکر قفال شاشی شافعی رحمہ اللہ (۲۰۹ھ۔۳۶۵ھ) کے مزار کی طرف روانہ ہوئے یہ مزار بھی اسی احاطے میں ہے، جس کی طرف جانے کا پیدل راستہ ہے، راستے کے دونوں طرف خوبصورت پودے، درخت، خوبصورت باغیچے وغیرہ ہیں، جو ان حضرات کی نیکی وصحبت کے ساتھ ساتھ فضا کو بھی معطر کر رہے تھے۔

یہاں ایک بات جو بھلانے کے قابل نہیں ہے وہ یہ ہے کہ مسجد سے نکل کر جب ہم مصحف عثمانی والی عمارت یا مدرسہ یا پھر مزار کی طرف جا رہے تھے ان تمام جگہوں میں ایک چیز دیکھنے کو ملی کہ راستے میں جتنے لوگ ملے وہ سب سلام کرنے والے تھے، ان میں بچے بوڑھے، مرد و عورت سب شامل تھے، ان کے سلام کا ایک خاص انداز تھا، وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر، گردن تھوڑی سی جھکا کر سلام شروع کرتے اور پھر سلام کی انتہا تک اسے تھوڑا جھکائے رکھتے اور بہت اچھے تلفظ کے ساتھ ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ“ کہتے تھے، ان کا سینے پر ہاتھ رکھ کر عاجزی کے ساتھ سلام کرنا اور اس کے ساتھ اپنی باچھوں کو مسکراہٹ بکھیرنے کے لئے حرکت دینا، پھر اسی پر کیف انداز میں اپنی آنکھوں کو ہلکا سا بند کرنا، جس سے خلوص و محبت اچھل اچھل کر آشکارا ہوا کرتی تھی، خصوصا جب معصوم چھوٹے چھوٹے بچے اسی انداز سے سلام کرتے اور ساتھ میں تعظیما ایک لمحہ کے لیے کھڑے ہونا ایسا تھا کہ اس پر فدا ہونے کو دل چاہتا تھا، یہ منظر اتنا پر کیف تھا جسے نہ میری تحریر بیان کر سکتی ہے، نہ میں اس کے لطف کو کاغذ کے دامن میں بکھیر سکتا ہوں، یہ کسی پھل کی طرح ایک ذائقہ ہے جسے چکھا تو جا سکتا ہے، لیکن بتلایا نہیں جا سکتا۔

خصوصا ایک بات جو بعض سفر ناموں میں پڑھی تھی، یہاں اس کا مشاہدہ کرنے کی نوبت آئی، جب ہم ابو بکر قفال شاشی رحمہ اللہ کے مزار کے قریب پہنچے تو کسی اسکول کے بچے بچیاں اپنے استاد کے ساتھ یہاں مزار پر فاتحہ خوانی کرنے آئے تھے، ہمیں دیکھ کر وہ سب کھڑے ہو گئے اور سب نے سینوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور ہمارے گروپ کا جو ساتھی بھی اندر جاتا تو یہ بچے بچیاں ان کو سلام کرتے ان کے استاد کی بھی سلام میں کیفیت وہی تھی جو ان بچوں کی نظر آرہی تھی، اپنے ساتھیوں کے کافی دیر بعد جب ہم ابو بکر قفال شاشی رحمہ اللہ کے مزار پر پہنچے تو یہ بچے اسی طرح انتظار میں کھڑے تھے، بعض سفر ناموں میں پڑھا تھا کہ یہاں کے لوگ داڑھی ٹوپی سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ کسی داڑھی والے کو دیکھتے ہیں تو تعظیما کھڑے ہو جاتے ہیں، ہم نے بھی ان بچوں کی یہی کیفیت دیکھی۔

اس کے ساتھ ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اسکول کے اساتذہ اب ان بچوں کو ایک بار پھر اپنے انہی اکابر سے آشنا کروا رہے ہیں، جن کے دم قدم سے آج ایک علمی دنیا آباد ہے، اور ایک بحر بیکراں رواں دواں ہے، لیکن ان کے نسبی اولادوں نے چونکہ دین کے لیے ظاہری آوازوں، نعروں سے متاثر ہو کر اپنی اصل کو

چھوڑدیا تو آج انہیں اپنے آباء کی خاک پا تک بھی پہنچنے کے لیے برسوں درکار ہوں گے، لیکن یہ بات قابل تعریف تھی کہ یہ اسکول کے اساتذہ ان بچوں کو اپنے بڑوں کے مزارات پر لے جاتے ہیں، جس سے ایک دن ان میں ان شاء اللہ حمیت دینی اور جذبہ ایمانی ایک بار پھر زندہ ہوگا اور وہ اپنے آباء کے نقش قدم پر چل کر ایک بار پھر امت کو سیراب کریں گے۔

دوسری اہم بات جو ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ: ''ہمیں دین اور اس پر چلنے کی آزادی کی قدر کرنی چاہیے، خود بھی اور اپنی اولاد کو بھی اپنے اکابر، ان کی تعلیمات، موجودہ دور میں موجود اکابر اور ان کی صحبتوں سے آشنا کروانا چاہیے؛ کیونکہ خدانخواستہ یہ نعمت اگر ہم سے چھن گئی تو ہم اپنی اولاد کو بعد میں بتلانے کے بھی قابل رہیں گے یا نہیں؟ ازبک مسلمانوں میں لوگوں نے جو قربانیاں دیں جس طرح اپنے دین کو بچانے کے لیے اپنے گھروں میں محصور ہوگئے، دین کی حفاظت کے لیے ہر قسم کے خطرات کو مول لیا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس سے بھی محروم ہوجائیں؛ کیونکہ آج اللہ نے یہ ملک عطا فرمایا ہے، یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے جس کے کونے کونے میں آپ کو دین دار مل جائے گا، داڑھی، ٹوپی، پردہ وغیرہ کی فراوانی نظر آئے گی، خدانخوانستہ اگر ہم سے یہ چھن گئی جیسا کہ ازبک سے چھن گئی تھی تو ہم بہت بے سروپا مخلوق رہ جائیں گے، اپنی اولادوں کو یہ بتلانے کے لائق بھی نہیں رہیں گے کہ ہمارے بڑے کیسے تھے اس لیے کہ جو سختیاں ازبک نے برداشت کی، جو پابندیاں ان پر لگیں وہ ہم پر نہیں، ہم داڑھی ٹوپی سے نفرت کرتے، اسے دہشت گردی کا سبب وذریعہ سمجھتے ہیں، جس کے نتائج وثمرات بہت برے اور بھیانک ہوں گے، جس کا ہمیں اندازہ بھی نہیں، باہر کی دنیا میں اس وقت جو محبوب چیز پاکستانیوں کی سمجھی جاتی ہے وہ ان کی دین داری اور دین سے محبت، دین پر مر مٹنے کا جذبہ ہے، اگر ہماری ناشکری کی وجہ سے یہ دولت ہم سے چھن گئی تو ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو ہم اہل دنیا کو خالص دے سکیں، سوائے ملاوٹ، مزاجوں، طبیعتوں کی گراوٹ کے، اس لیے ابھی ہمارے پاس وقت ہے کہ اس دین کی قدردانی کریں، اس لباس وتہذیب اسلامی کو اپنی زندگیوں میں لے آئیں، تاکہ ہم قصہ پارینہ نہ ہوجائیں، اور کل کو مردہ پرستی کرتے ہوئے ان علماء واکابر کے مزاروں پر اپنے بچوں کو لے جارہے ہوں جن کو آج ہم گالیاں دے رہے ہیں۔

بہرحال ازبک اساتذہ کا اپنے بچوں کو اپنے بزرگوں کے مزارات پر لے جانا بھی ایک اچھا اقدام ہے، جو

ان کی بیداری کا ایک سبب وذریعہ ہے۔

مزار میں پہنچ کر پہلے امام ابو بکر قفال شاشی رحمہ اللہ[1] کی قبر ہے جو زیادہ اونچی نہیں بنی، ایک طرف پڑے یہ ایک مرد قلندر اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے، جو یقینا بوریا نشین تھے، جن کے پاس نہ تخت تھا اور نہ ہی ملک وسلطنت، لیکن دین کی خدمت جو انہوں نے اس زمانے میں کی اس کا صلہ اللہ تبارک وتعالی نے یہ عطا فرمایا کہ آج بھی لوگ ان کے مزار پر دور دور سے فاتحہ خوانی کرنے آتے ہیں اور ان کے فیوض سے مستفیض ہونے کی دعائیں کیا کرتے ہیں۔

اسی مزار کے احاطے میں کچھ مزید قبریں بھی ہیں جو بادشاہان وقت کی اور ان کے خاندان کے بعض افراد کی ہیں، جنہوں نے علم دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے یا تو خود ان علماء دین کے قرب میں اپنے لیے جگہ پسند کی یا پھر اپنے لیے بنوائی گئی جگہوں میں ان علماء کے لیے جگہیں مختص کیں بہر صورت یہ ان کی علم دوستی کی دلیل ہے۔

مزار امام ابو بکر قفال شاشی سے فاتحہ خوانی کر کے فارغ ہو کر باہر جب آئے تو معلوم ہوا کہ وہ اسکول کے بچے فاتحہ خوانی کے لئے آئے تھے اب تک اندر نہ جاسکے صرف اس لیے کہ یہ داڑھی ٹوپی والے فارغ ہو جائیں تو اس کے بعد ہم اندر چلے جائیں گے۔

۵- مکتبۃ امام بخاری:

مزار سے باہر نکلے تو چند قدم کے فاصلے پر ایک مکتبہ نظر آیا جس کے اندر پہنچے تو کتابیں (جو ازبک اور بعض عربی زبان میں لکھی گئی تھیں) فروخت ہو رہی تھیں، ہمارے لیے یہاں خرید وفروخت ایک مشکل مرحلہ اس لیے بھی تھا کہ نہ ہمیں ان کی زبان آئے اور نہ ان کو ہماری، لیکن یہاں بھی عام معمول کے مطابق جب بھی کوئی پاکستانی یا ہندوستانی آتا تو اردو جاننے والے جلدی اس کی طرف لپکتے تاکہ اسے ڈیل کر سکیں، چنانچہ جب ہم اپنی بات انہیں سمجھانے اور ان کی بات سمجھنے سے قاصر ہوئے تو ایک ازبک لڑکی جو اردو بہت اچھی طرح بول لیتی تھی وہ آئی اور پھر مکتبہ اور اس کی کتابوں کا تعارف کروانا شروع کیا۔

اس چھوٹے سے مکتبے میں کتابیں تو بہت کم تھیں، لیکن ستر سال تک روسی تسلط میں رہنے کے باوجود اس طرح کتابوں کا چھاپنا بہت بڑی بات ہے، اس لیے کہ روسی استعمار کے دور میں عربی اور دینی کتابیں تو کجا، عربی الفاظ کے بولنے پر بھی پابندی تھی، عربی ناموں تک کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، مساجد میں میوزک شروع کیا، قرآن کریم کے پڑھنے پر پابندی عائد کی، غرض دین سے جڑی کوئی بھی چیز ان کے ہاں مقبول نہیں تھی، اس قدر تنگ دستی اور سخت روی کے بعد پچیس سال میں اس درجہ تک پہنچ جانا کہ عربی کتابیں اور ازبکی زبان میں دینی کتابیں چھاپ دینا میرے خیال میں ایک بہت بڑی بات ہے جس کا اندازہ ہمارے لیے لگانا شاید مشکل ہو، وہی جان سکیں گے جو روسی دور کو دیکھ چکے ہیں۔

بہر حال یہاں سے تین چار کتابیں جو عربی زبان میں لکھی تھیں، بیس ڈالر میں خریدیں، چونکہ ازبکستان میں یہ پہلی خریداری تھی اس لیے ان کی سڑکیں، ان کے مواصلاتی نظام، ان کی صفائی ستھرائی، ان کی معیاری چیزیں، ان کا ذوق تعمیر دیکھ کر خیال یہی تھا کہ یہاں کی ہر چیز ایسی نفیس ہی ہوگی، لیکن جب ان کے ہاں کی تھیلیاں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی تھیلیوں سے بھی بہت کمزور تھیں، جس میں تھوڑے سے وزن کے برداشت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں تھی، اس کے پیچھے کوئی خاص غرض پنہاں تھی، یا پھر سہولت نہیں تھی، لیکن کیفیت تھیلیوں کی یہی تھی۔

جب دکان دار حضرات کو معلوم ہوا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں، اور ہمارے ساتھ بہت سے علماء بھی ہیں تو دیگر لوگوں کی طرح یہ بھی بہت خوش ہوئے، خریداری کے بعد جب ہم جانے لگے تو انہوں نے ہمیں تسبیح ہدیہ دی اور ہم ان سے رخصت ہوئے۔

۶- معہد الامام البخاری

مکتبہ سے فارغ ہو کر ہم واپس بس کی طرف جا رہے کہ راستے میں معہد الامام البخاری رحمہ اللہ نظر آیا، اسے ہم نے مزار کی طرف جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا، لیکن ہمیں یہ بتلایا گیا کہ آج چونکہ چھٹی ہے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے ہم بھی باہر سے دیکھ کر ہی گزر رہے تھے، لیکن واپسی میں یہاں پڑھنے والے کچھ طلبہ

نظر آئے، وہ نظر کیا آئے بلکہ نظروں پر ہی چھا گئے، استاد محترم کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ طلبہ دیگر علماء سے محو گفتگو ہو چکے تھے اور ان سے دعا کا عرض کر چکے تھے اور شاید چند علماء دعا بھی کروا چکے تھے، لیکن ان طلبہ کی تڑپ، ان کی علم کی طلب دیکھ کر کچھ عجیب سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی، مولانا عزیز الرحمن رحمانی صاحب ہم سے پہلے ان طلبہ کے ساتھ کھڑے تھے، انہوں نے انہیں استاد محترم کے بارے میں بتایا اور دعا کا کہا، اب تو جیسے یہ طلبہ لپک گئے تھے، کئی طلبہ کو دیکھا آنکھوں میں آنسوؤں کے گچھے لٹکائے آئے اور تسبیح کے دانوں کی طرح تسلسل سے بہانے لگے، ہر ایک کی خواہش یہی تھی کی استاد محترم ان کے لیے دعا کروائیں، اور دعا بھی یہ کہ اللہ ہمیں اور ہماری اولادوں کو علم دین کے لیے قبول کرے، کئی طلبہ آئے اور جو بھی نیا طالب علم آتا اس کی چاہت یہی ہوتی کہ اس کے لیے الگ سے ہاتھ اٹھایا جائے، چنانچہ استاد جی نے بھی دعا کرنے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے میں خوب فیاضی کی، بار بار ہاتھ اٹھانے سے بھی باوجود پیرانہ سالی کے نہیں کترائے، بلکہ ہر بار ہاتھ اٹھا کر دعا فرمالیا کرتے تھے۔

یہ ثانویہ کے طلبہ تھے جو بہت اچھی عربی بول رہے تھے، باوجود وسائل کی کمی کے، ان لوگوں نے علم دین پر دوبارہ جو محنت شروع کی ہے وہ ان شاء اللہ جلد انہیں اپنے منزل مقصود تک پہنچا دے گا، ان کی عربی بہت عمدہ تھی، لیکن استاد محترم سے بات کرتے ہوئے ایک طالب علم کی زبان میں ایک روتے ہوئے شخص کی طرح یا بہت خوش ہونے والے شخص کی طرح لرزہ طاری تھا، یا خود کو ایسے بڑے شیخ کے سامنے پا کر خوشی کے مارے بالکل بے زبان سے ہو گیا تھا بعد میں جب دیگر ساتھیوں سے ملا تو عربی خوب روانی سے بول رہا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت۔

ع یا رعب حسن سے ساکت تھا یا فرط حیا سے مہر بلب

ان کی عربی سننے لائق اور ہمارے ابتدائی طلبہ کے لیے نمونہ تھی اور ان کا ذوق ایمانی دیدنی تھا، جس سے ہمیں اپنی نعمت (چاہے وہ پاکستان کی شکل میں ہو یا علم دین کی شکل میں) کے بارے میں سوچنے کا موقع ملا کہ اللہ تبارک وتعالی نے ہمیں کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے، ہمیں اس کی پل پل قدر کرنی چاہیے، اگر آج یہ علم و علماء اٹھ جائیں تو ہمیں علم تو کجا اہل علم کے آثار بھی نظر نہیں آئیں گے۔

پاکستانی ریسٹورنٹ میں کھانا:

رات کا کھانا کھانے کے لیے شالیمار پاکستانی ریسٹورنٹ پہنچے، جہاں پاکستانی کھانے تھے، یہ ہمارا ریسٹورنٹ میں پہلا کھانا تھا، ورنہ دوپہر کا کھانا جو ہم نے جہاز میں کھایا تھا وہی ہمارے لیے ظہرانہ بھی تھا، اب مغرب کی نماز کے لیے جب ہم رکے تو اس کے بعد ہم نے رات کا کھانا بھی کھایا، ہوٹل پاکستانی تھا، شاید ہوٹل کا مالک بھی پاکستانی ہی تھا، لیکن کام کرنے والی خواتین ازبکی تھیں، ہوٹل کے محل وقوع میں بھی کوئی خاص فرق نہیں تھا پاکستانی ہوٹلوں سے، صفائی بہر حال ہر جگہ کی دیدنی تھی، کہیں گول ٹیبلیں لگی تھیں، کہیں لمبی ٹیبلیں بچھائی تھیں، کسی کے ساتھ صرف کرسیاں تھیں، کوئی ٹیبل صوفوں کی ہمنشین تھی، پاکستان کے مختلف مقامات کی تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں، ہمارے اور عملہ کے درمیان رابطہ کاری کا واحد ذریعہ بھائی سنجار تھے، اگرچہ اس ہوٹل میں ہمیں تین افراد میسر ہوگئے تھے، ایک بھائی سنجار، دوسرے بھائی حامد، تیسرے ہوٹل مینیجر یا مالک، لیکن بھائی سنجار کھانے کے معاملے میں بہت محتاط، ہر چیز کو خود دیکھتے رہے، ہر چیز کے بارے میں خود پوچھتے رہے، ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنی نظر میں رکھتے، ایسا لگتا تھا جیسے یہ صرف ہمارے گائیڈ ہی نہیں، بلکہ یہ سارے ہوٹل ان کے ہیں اور یہ ہماری شکایات بھی خود ہی دور کریں گے۔

کھانا اسی طرح پاکستانی تھا، مختلف پاکستانی کھانے لذیذ بنائے تھے، ساتھیوں نے خوب کھایا، بلکہ کھانے کا حال تو یہ ہو گیا تھا کہ پاکستانی ہوٹل میں پاکستانیوں کے لیے روٹی پوری کرنا مسئلہ بن گیا تھا، ادھر روٹی آتی ادھر ختم ہو جاتی، عملہ بھی پریشان تھا اور ساتھیوں کے لیے بھی دشواری ہو رہی تھی، لیکن بہر حال کھانا عمدہ اور لذیذ تھا ساتھیوں نے خوب کھایا۔

ایک چیز جو یہاں بہت زیادہ عام تھی وہ ان تمام ہوٹلوں میں بنے بار کاؤنٹر تھے، ہمارے آنے سے پہلے ہمارے گروپ ذمہ داروں نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ وہ سامنے سے شراب وغیرہ ہٹوادیتے تھے، لیکن ظاہر ہے اس کی کیفیت تو نہیں بدلی جاسکتی، ازبک حکومت اور ہمارے ادارے نے واقعۃً ہمارا اس سلسلے میں بڑا خیال رکھا، اللہ ان سب حضرات کو اس پر اجر عظیم عطا فرمائیں، یہاں اس ہوٹل میں بھی اسی طرح کا کاؤنٹر تھا جس میں انداز وہی تھا، لیکن اس میں جوس وغیرہ صرف رکھے تھے باقی چیزیں نہیں تھیں، یا شاید بندے کو نظر نہیں آئیں۔

ازبک کرنسی اور موبائل سم:

اسی ہوٹل میں ہمیں ازبک کرنسی بھی لینی تھی، مفتی رضوان عزیز صاحب نے بس ہی میں پیسے جمع کر لیے تھے جو یہاں تقسیم ہونے تھے، بندہ نے کچھ ڈالر دیئے تاکہ کچھ رقم ہاتھ آئے تو اس سے خریداری کی جاسکے، روبل کے گرنے کے بعد اگرچہ اکثر ممالک کی کرنسی گر گئی تھی، لیکن ازبک کرنسی کافی گر چکی تھی، پاکستانی ایک روپیہ ازبک ۶۵ روپے کے برابر تھا، خیر آٹھ لاکھ سوم ہمیں یہاں دیئے گئے، جو گڈی کی شکل میں ملے اور ہم نے وہ رقم اسی طرح جیب میں رکھی، پہلی مرتبہ کوئی ملک ایسا دیکھا جہاں پاکستانی پیسے کی اتنی قدر تھی کہ ایک روپیہ پینسٹھ روپے کے برابر تھا، یہاں پہلی مرتبہ ہمارا پیسہ زیادہ قیمت والا تھا، لیکن ایک دشواری اور تھی، حساب کتاب یہاں بھی کرنا پڑ رہا تھا، لیکن وہ اس لیے کہ ان کے پیسے کی قیمت کم تھی تو جب وہ بیس ہزار تیس ہزار سوم ایک چھوٹی سی چیز کی قیمت بتاتے تو ایک گونہ ڈر سا لگنے لگتا تھا پھر اطمینان ہوتا کہ نہیں زیادہ نہیں ہے۔

سم کارڈ کے لیے انہوں نے ہم سے ایک لاکھ "سوم" لیے، جو پاکستانی "۱۵۳۸" روپے کے برابر تھے، اس میں چار جی بی ڈیٹا، ازبک فون اور میسج فری تھا، فون کی یہ سہولت بھی ازبکستان میں موجود تھی کہ ایک پاسپورٹ پر آپ تین سمیں نکلوا سکتے ہیں، حامد بھائی نے سب سے معلوم کیا تو تیس ساتھیوں نے سمیں لینے کے لیے کہا، دس پاسپورٹ لے جاکر تیس سمیں نکلوائی گئیں، جو کھانے سے فراغت کے بعد کمرے میں جاکر ملیں۔

گولڈن ویلی ہوٹل میں قیام:

کھانے سے فراغت کے بعد ہم بس میں بیٹھ کر اپنی قیام گاہ (گولڈن ویلی ہوٹل) پہنچے، یہ سڑک سے چند قدم کے فاصلے پر اندر گلی کی طرف ایک ہوٹل تھا، یہ "فوراسٹار" ہوٹل ہے، جس کے ساتھ ایک پارک بھی موجود تھا، یہ واٹر پارک تھا، جو یہاں کی بکنگ والوں کے لئے فری تھا، لیکن واٹر پارک کے بارے میں ہم اس لیے بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ سردی تھی اور دوسری وجہ یہ بھی کہ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی بھی کوئی ترتیب ہے۔

ہوٹل پہنچ کر ہم نے اپنا سامان اتارا، اور لاؤنج میں بچھے عمدہ صوفوں پر بیٹھ گئے، ادھر بھائی سنجار اور مفتی رضوان صاحب سب کے پاسپورٹ (۱) لے کر کاؤنٹر پہنچے اور شرکاء کے درمیان چابیاں تقسیم کرنے کا مرحلہ شروع ہوا، تمام شرکاء میں کمرے دوبیڈ والے تقسیم ہوئے، ابتدا میں تو مشکلات اس لیے پیش آئیں کہ یہ ہمارے اس سفر کا کسی ہوٹل میں پہلا قیام تھا اور شرکاء سب ایک جگہ سے نہیں آئے تھے، بلکہ ملک کے مختلف علاقوں سے جمع ہوئے تھے اس لیے سمجھنا مشکل تھا کہ کس کو کس کے ساتھ ہونا ہے، جس کی وجہ سے اضافی وقت بھی لگا، لیکن گروپ کے بعض افراد کے توجہ دلانے پر استاد محترم مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب اور مفتی حسن صاحب اور قاضی ارشد الحسینی صاحب جیسے بزرگوں کو کمرے جلد دینے کا فیصلہ ہوا اور استاد جی کو کمرہ جلدی دیکر کمرے بھجوا دیا گیا، بندہ استاد محترم کے ساتھ تھا ہمیں کمرہ نمبر ۳۰۴ دیا گیا، جو دوبیڈ کا کمرہ تھا اور اس میں تین بیڈ بچھے ہوئے تھے، کافی کشادہ کمرہ تھا، جس میں ہر سہولت موجود تھی، ایسی، ہیٹر سب سہولیات موجود تھی، بیڈ کے ساتھ لگے انٹر کام، پانی کی بوتلیں، عمدہ اور صاف ستھرے بیت الخلا سب کچھ موجود تھا، دروازے سے داخل ہوتے ہی سامنے کی طرف کشادہ اور کئی کھڑکیاں بھی تھیں، جس پر ڈبل پردہ لگایا گیا تھا، پردہ ہٹا کر دیکھا تو سامنے کی طرف ایک بہت بڑا پلاٹ خالی تھا، اس کے بعد تاشقند کا ایک خوبصورت منظر نظروں کے سامنے تھا، جو واقعۃ اپنی سادگی اور دلکشی کا ایک حسین امتزاج تھا۔

یہاں ہوٹلوں میں ایک مسئلہ تھا کہ ان کے بیت الخلا کموڈ والے تو تھے ہی، لیکن یہاں کسی ہوٹل کے کمرے میں بندہ نے کموڈ کے ساتھ پانی کا نظام نہیں دیکھا، زیادہ سے زیادہ کموڈ کی صفائی کے لیے پانی تو موجود تھا، لیکن آب دست کے لیے پانی نظر نہیں آیا، لیکن ہم جو پاکستانی ٹھہرے ہر جگہ جگاڑ تو ہمارے پاس موجود ہوتا ہے، یہاں بھی ہم نے جگاڑ ہی سے کام چلایا، اس کی ساتھیوں نے دو صورتیں اختیار کیں: ا۔ بعض بیت الخلاؤں میں نہانے کا ٹب کموڈ کے قریب ہی تھا، اور ٹب کے شاور کا پائپ لمبا تھا، بسا اوقات تو یہی شاور آب دست کے

---

(۱) چونکہ پاسپورٹ جمع کرانا ضروری تھا اس لیے سب سے پاسپورٹ جمع کیے گئے، اور یہ ہر ہوٹل میں ایک رات کے لیے بھی قیام ہوتا تو جمع کرانے ضروری تھے، اور ہوٹل واؤچر ملتا جو کسی بھی جگہ پر حکومتی کارندے ہم سے پوچھ سکتے تھے، یہ کام ہم میں سے کسی کو نہیں کرنا پڑا؛ کیونکہ بھائی سنجار ہی کے پاس پاسپورٹ تھے وہ خود ہی واؤچر بھی لے لیتے اور خود ہی جمع بھی کروا دیتے تھے، ہمیں اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

کام آجاتا تھا، لیکن بسا اوقات یہ پائپ بھی کموڈ تک نہیں پہنچ پاتا تھا تو اس لیے ۲۔ دوسری صورت اختیار کرنی پڑتی تھی کہ یہاں نہ لوٹا تھا اور نہ کموڈ شاور تو پھر چھوٹی بوتل کو بھر کر لوٹے کے طور پر استعمال کر لیا کرتے تھے۔

اس کی وجہ اور سبب تو معلوم نہ ہو سکا کہ کموڈ والے بیت الخلا میں پانی کی ترتیب کیوں نہ تھی، دیگر ممالک چونکہ بندہ نے دیکھے نہیں اس لیے ان کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ وہاں بھی یہی ترتیب ہے، یا پھر روسی استعمار سے آزاد شدہ ممالک کا حال یہی ہے، البتہ دبئ، سعودی وغیرہ میں استنجا کے لیے پانی ضرور ہوتا تھا، تعجب اسی لیے ہو رہا تھا کہ جب مسلمان ملک ہے تو پھر استنجا کے لیے پانی کی ترتیب کیوں نہیں بنائی گئ؟، لیکن پانی کے مسئلہ کے علاوہ باقی چیزیں بہت عمدہ اور نفاست کے ساتھ بنائی گئی تھیں اور صاف ستھری رکھی گئی تھیں۔

ہوٹل اپنے کمرے پہنچ کر نماز کی تیاری کی اور یہی کمرے میں استاد محترم کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کی، رات کا کھانا چونکہ ہم پہلے ہی کھا چکے تھے، اس لیے استاد محترم نے نماز پڑھی اور سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئے۔

یہاں چند چیزیں استاد محترم سے متعلق عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

۱-اہتمام نماز:

استاد محترم بار بار نماز کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے، کہ "میاں نماز کہاں پڑھنی ہے؟ کب پڑھنی ہے؟" اور اس کی وجہ جو کئی مرتبہ استاد محترم سے کلاس میں بھی سنی کہ "ہم نے علماء دیوبند میں باجماعت نماز اور تلاوت قرآن کا خوب اہتمام دیکھا"، اس لیے استاد محترم کو بھی اس معاملے میں بڑا ہی محتاط اور اہتمام کرنے والا پایا، کبھی اگر نماز میں دیر ہو جاتی تو بندہ کو بار بار استاد محترم کی ایسی باتیں سننے کو ملتیں جس سے معلوم ہوتا کہ استاد جی کو بہت تکلیف ہوئی ہے۔

۲-مشاہدہ کی حفاظت:

استاد محترم کے ساتھ دن بھر رہنا ہوتا تھا، لیکن دن بھر کوئی تبصرہ سننے کو نہیں ملتا تھا، جب رات کمرے

میں تشریف لاتے تو ایسا لگتا تھا جیسے دن بھر ہر چیز کا خوب مشاہدہ کیا ہو اور اب رات اس پر تبصرہ فرما رہے ہوں، اس سے جو بات بندہ کو سیکھنے کی ملی وہ یہ تھی کہ: وقت تبصروں میں ضائع کرنے سے بہتر یہ ہو تا کہ آدمی اپنی مشاہدات کو بیان کرنے والی "زبان" کو کم استعمال کرے اور مشاہدہ کرنے والے اعضاء "حواس" اور خصوصا "آنکھوں" کو خوب استعمال کرے مشاہدہ کرے اور جو چیز دوسروں کے فائدہ کی ہو صرف اسی کو دوسروں کے سامنے بیان کرے۔

۳-ہم سفر کا خیال رکھنا:

یہ تو استاد محترم کے دن بھر کا بھی معمول تھا، لیکن رات میں اس کا خوب مشاہدہ اس طور پر ہو تا تھا، کہ استاد جی ضرورت کی چیزوں کے بارے میں سونے سے پہلے معلوم کر لیتے تا کہ رات کو کسی کے جگانے کی نوبت نہ آئے اور انہیں تکلیف نہ ہو، بارہا دیکھا کہ رات کو کوئی ضرورت پیش آئی تو آہستگی سے اٹھتے، بندہ کی آنکھ کھل جاتی تو پتہ چلتا کہ کہیں جانے کی یا کسی چیز کی ضرورت ہے، پوچھنے پر فرماتے: "ارے حضرت آپ زحمت نہ کریں، آپ سو جائیں میں خود یہ کام کر لیتا ہوں"، جس سے ایک طرف تو استاد محترم کے کمال احتیاط اور کمال رعایت غیر کا پتہ چلتا تھا تو دوسری طرف بندہ کو احساس محرومی بھی ہونے لگتی کہ اب تک بندہ استاد محترم کے لیے ایسا نہیں ہو پایا کہ بے تکلف کسی بھی کام کا کہہ دیں، لیکن استاد محترم کا یہ معاملہ تو چونکہ گھر میں بھی دیکھ رکھا تھا، اس لیے زیادہ محسوس کرنے سے اپنے کو بچاتے ہی رہتے تھے۔

۴-چیزوں کا خیال رکھنا:

اپنی اور دوسرے رفیق سفر کے سامان کا خیال رکھنا بھی استاد محترم کی ایک خاص عادت ہے، چشمہ تک میں احتیاط فرمایا کرتے تھے، کئی بار دیکھا کہ چشمہ خود رکھتے، بلکہ ایک مرتبہ خود رکھ کر فرمانے لگے "میاں چشمہ اس طرح رکھا کرو تو کبھی خراب نہیں ہو گا"، کوئی چیز اگر کسی ساتھی کی کہیں نظر آجائے تو اس کا خیال رکھتے ہیں۔

استاد محترم کے لیٹ جانے کے بعد اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل گیا، مولانا یاسر صاحب مولانا

عمران ممتاز صاحب کے کمرے میں پہنچا، کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر ہوٹل سے باہر قہوے کے ارادے سے نکل آئے۔

ہلکی ہلکی ٹھنڈ، ساتھ میں ایک نیا ملک، گلیوں کا سناٹا، پرندوں کی خاموشی، درختوں کا ہجوم، سڑکوں کی صفائی دیکھتے ہوئے کچھ دیر چہل قدمی اور قہوہ کی چاہ لے کر باہر نکلے تھے، شہر کے مرکزی بازار تو رات مغرب کے فوراً بعد بند ہو جاتے ہیں، البتہ گلی محلوں کی دکانیں یا ہوٹلوں کے قریب کی مارکیٹوں میں سے کچھ بڑی دکانیں رات دیر تک کھلی رہتی ہیں، ہم چہل قدمی کے ساتھ ساتھ قہوہ کی تلاش میں بھی نظریں گھماتے رہے، کہیں قہوہ خانہ نظر آئے، تو بیٹھ کر قہوہ پی لیں، لیکن قہوہ خانے کا کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا، نہ ہمیں وہاں کے لوگوں کی زبان آرہی تھی، جو کچھ لوگ نظر آرہے تو انہیں قہوہ کہنے کے باوجود وہ سمجھ نہیں پارہے تھے، ایک جگہ تو یہ بھی ہوا کہ دور سے ایک دکان کھلی نظر آئی، جو دکھنے میں بالکل چائے خانہ کی طرح لگ رہی تھی، جب ہم اس کے قریب پہنچے تا کہ اندر جا کر پوچھیں تو داخل ہوئے بھی نہیں تھے کہ نظر وہاں رکھی ہوئی بوتلوں پر پڑ گئی، لاحول پڑھتے ہوئے باہر نکل آئے، جب باہر نکلے تو قریب کھڑے ہوئے لوگ ہمیں غور سے دیکھنے لگے، بندہ نے سمجھانے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ پینے کے لیے قہوہ چاہیے، اب بار کے پاس سے ہوتے ہوئے آئے اور ہاتھ کا اشارہ پینے کے لیے کر دیا تو پتہ نہیں وہ کیا سمجھے، لیکن وہ صرف ایک ہی جملہ بول رہے تھے، ہوتل، ہوتل "گولدن ویلی"، ہم بھی سمجھ گئے کہ یہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ جو چاہیے وہ اپنے ہوٹل سے لے لو۔

خیر ہم ان کی سنی اَن سنی کر کے آگے بڑھے اور ایک دکان چلے گئے جو سپر مارکیٹ طرح کی دکان تھی اور ہر قسم کی چیزیں اس میں موجود تھی، ہم سمجھے کہ یہیں خود سے دیکھنا شروع کر دیں؛ کیونکہ نہ وہ انگریزی سمجھ رہے تھے، نہ فارسی نہ اردو، ہم نے مختلف چیزیں اپنے حساب سے اٹھائیں اور کاؤنٹر پر پہنچ گئے، لیکن ایک مصیبت اب بھی برقرار تھی کہ ان کے بتائی ہوئی رقم ہم کیسے جانیں گے، اس لیے کہ وہ ازبکی یا رشین ہی جانتے تھے، کسی چیز کے بارے میں ہم نے پوچھا تو انہیں سمجھ نہیں آئی انہوں نے فوراً ہوٹل گولڈن ویلی کے کاؤنٹر فون کیا اور ان سے بات کروائی، انہوں نے انگلش میں پوچھ کر دکان دار کو ازبکی میں سمجھایا تو اس نے ہمیں جواب دیا کہ نہیں یہ موجود نہیں ہے۔

اس چند منٹ کی چہل قدمی کے دوران جو چیز مشاہدہ کی وہ درج ذیل ہے:

۱- یہاں کسی کو آوارگی سے گھومتے پھرتے نہیں دیکھا، نوجوان لڑکے، لڑکیاں باوجود اس قدر آزادی

کے ہمیں نظر نہیں آئے کہ وہ راتوں کو آوارگی کے ساتھ گھومتے ہوں، چند ادھیڑ عمر لوگ جو شاید چہل قدمی یا پھر کچھ دیر گپ شپ کے لیے باہر نکلے ہوں گے، یا اپنی دکانوں میں کام کر رہے تھے وہی موجود تھے۔

۲- شور شرابہ، گانے زور زور سے بجانے کی ریت بھی نہیں ہے، لوگ پر سکون رہتے ہیں، زیادہ شور شرابہ کو پسند بھی نہیں کرتے، اگر کہیں پر شور شرابہ ہو بھی تو شاید وہ مخصوص جگہیں ہوں گی۔

۳- دکاندار انگلش، فارسی زیادہ نہیں جانتے، اس لیے یا رشین یا پھر ازبکی زبان ہی سے واقف ہیں، اس لیے یہاں گھومنے والے کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی ضروریات سے متعلق ازبکی الفاظ سیکھ لے، ورنہ وہاں اشارے سے سمجھانا بھی کارے دارد۔

۴- شراب یہاں بہت عام ملتی ہے، ہر چھوٹی بڑی دکان میں چھوٹی بڑی بوتلیں نظر آتی ہیں، جس طرح سے ہمارے ہاں کولڈ ڈرنک فروخت ہوتی ہے، اس طرح وہاں شراب فروخت ہوتی ہے، یہاںتک کہ آئسکریم کی دکان پر بھی شراب فروخت ہوتی ہے، جس سے بعض سفر نامہ نگاروں کی وہ بات بالکل سچ معلوم ہوتی ہے کہ رشیا نے آنے کے بعد پوری کوشش کی کہ شراب کو پانی سے زیادہ عام کیا جائے، یہاںتک کہ یہ مجبور ہو جائیں شراب کے پینے پر، اور شراب ام الخبائث ہے لہذا دوسرے خبیث کام یہ خود سے کریں گے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کو جو کروانا ہوتا ہے اس کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنا کرتی ہے۔

۵- شراب کے اس قدر عام ہونے کے باوجود کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ کسی بار کے باہر جھومتا ہوا گزرا ہو، بلکہ یہ حرام اور خبث کام شاید اپنے گھروں ہی میں کرتے ہوں گے، یا شاید اس قسم کا کوئی قانون ہو گا، بہر حال شراب بہت عام ہے، اللہ کرے کہ موجودہ صدر ”شوکت مرزایوف“ اس کے لیے کوئی قانون سازی کر کے اس لعنت کو ملک سے ختم کرے۔

۶- یہاں کے لوگ رہنمائی کرنے میں بخل نہیں کرتے، ہاں جس چیز کے بارے میں معلوم نہ ہوں تو معذرت خواہانہ لہجے میں بتا دیتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں، چاہے سمجھ کی نفی کرنی ہو یا علم کی نفی کرنی ہو۔

۷- گلیاں کوچے صاف ستھری ہیں، باوجود اس کے کہ درختوں کی تعداد زیادہ ہے، سڑکیں پتوں وغیرہ سے بالکل صاف رکھتے ہیں، بہت کم کہیں پر پتے بھی پڑے ہوئے نظر آتے ہیں ورنہ تو پتے بھی صاف کر دیتے ہیں۔

رات کی اس چہل قدمی سے فارغ ہو کر ہوٹل پہنچے اور آرام کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے، اس لیے

کہ صبح تاشقند سے ترمذ کے لیے روانہ ہونا ہے، استاد محترم آرام فرما رہے تھے، بندہ بھی جا کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا، اللہ تبارک و تعالی نے اپنا خصوصی فضل فرمایا اور پہلا دن بخیر و عافیت پورا ہو گیا، نہ بیماری رہی، نہ استاد محترم کی برکت سے تھکاوٹ کا احساس، یوں رات گزارنے کے ارادے سے بستر پر دراز ہوئے تاکہ صبح فجر کی نماز کے لیے جاگنے میں دشواری نہ ہو۔

تاشقند کا درجہ حرارت ۱۰ سینٹی گریڈ تھا، سردی ہم کراچی والوں کے لیے زیادہ تھی، لیکن کمرے کے اندر سردی کا بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ کمرے میں ہیٹر چل رہا تھا جس کا نہ احساس ہو رہا تھا، نہ ہی گرمی محسوس ہو رہی تھی، اس لیے کوئی لحاف وغیرہ اوڑھنے کی بھی ضرورت نہ تھی، اللہ کا نام لے کر سو گئے اور صبح فجر کی نماز کے لیے جاگے، نماز کی تیاری کے بعد باجماعت نماز ادا کی، ہمارے آنے سے پہلے ہمارے کمروں میں مصلے پہنچا دیئے گئے تھے، مصلے سفری تھے، جو بہت ہلکے سے ہوتے ہیں، لیکن چونکہ یہاں پر عام رواج سیاحوں کا نماز نہ پڑھنے کا ہے اس لیے شاید نماز کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا، نہ نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص ہے، نہ ہی بڑے مصلے بچھائے گئے ہیں، نماز فجر سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد ناشتہ کے لیے پہنچے، ناشتہ کے بعد سامان اٹھا کر ہم صبح سات بجے لاؤنج پہنچ گئے، کمروں کی چابیاں واپس کیں اور سامان بس میں رکھا۔

ترمذ کے لیے روانگی:

ساڑھے سات بجے بس میں سوار ہو کر ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے، تاشقند سے ترمذ تک کا سفر جہاز کا تھا، کیونکہ رقبہ کے لحاظ سے ازبکستان پاکستان سے بڑا ہے، لیکن آبادی کے لحاظ سے بہت چھوٹا ملک ہے، پھر تاشقند سے ترمذ کے درمیان ۶۸۴ کلو میٹر کا فاصلہ ہے جس کے لیے ہمیں کم از کم ۹ گھنٹے درکار تھے، ہمارے پاس دن بہت کم تھے، اس لیے گروپ والوں نے شاید کچھ سفر جہاز کا بھی طے کیا، تاکہ سفر میں آسانی ہو اور کم دن میں ہم زیادہ جگہیں دیکھ سکیں، ترمذ میں ٹوورسٹ کا آنا بھی کم ہے، اس لیے یہاں ہوٹلوں کا نظام بھی زیادہ نہیں اور عام طور پر آنے والے گروپوں میں ترمذ کو شامل نہیں کیا جاتا، ہمارے گروپ میں چونکہ زیادہ علماء تھے، اور بہت سوں کا علم حدیث سے تعلق بھی تھا، اس لیے ازبکستان آ کر امام ترمذی رحمہ اللہ کے شہر میں، ان کے مزار

پر حاضری دیئے بغیر جانا بالکل مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا، چنانچہ ہمارے سفر کی ترتیب بنانے والے مولانا رضوان عزیز صاحب نے ترمذ کو بھی ساتھ میں شامل رکھا، اللہ انہیں اور بھائی حامد صاحب کو اس پر اجر عظیم عطا فرمائیں۔

ائیرپورٹ پہنچ کر سامان وغیرہ اتارا اور ائیرپورٹ میں اندر داخلے کے لیے روانہ ہوئے، واجبی سی تلاشی کے بعد ائیرپورٹ میں بورڈنگ کے لیے بیٹھے ہم سب کے پاسپورٹ بھائی سنجار اور مفتی رضوان صاحب کے پاس تھے، بھائی حامد صاحب بھی خود موجود تھے، سارے مراحل خود ہی کروادیئے ہم سب ایک طرف بیٹھے رہے، سامان بھی سب کا ایک ساتھ جمع ہوا، بورڈنگ پاس ملنے کے بعد ہمیں وی آئی پی لاؤنج میں بٹھا دیا گیا، ہم وہاں صوفوں پر بیٹھ گئے اور جوس، پانی وغیرہ سب ہمارے سامنے رکھا ہوا تھا، چائے، کافی ہر قسم کی سہولت یہاں وی آئی پی لاؤنج میں موجود تھی، یہاں کچھ بوتلیں بھی رکھی تھیں، جن میں سے ایک بوتل جس پر "Pure watar" لکھا تھا، اس سے گلاس بھراتا کہ اسے پی سکیں، ابھی اٹھایا ہی تھا کہ ایک ساتھی نے آواز دے کر روک لیا کہ اسے پہلے دیکھ لیں ہے کیا چیز ہے؟، بندہ نے دوبارہ دیکھا تو وہی پیور واٹر لکھا ہوا پایا، اب جب اسے چکھا تو ذائقہ بالکل تبدیل تھا واپس رکھ دیا، ساتھی کے بتانے سے بتا چلا کہ وہ سوڈا ہے جو اکیلے نہیں پیتے بلکہ کسی چیز کے ساتھ ملا کر پیتے ہیں، تب اندازہ ہوا کہ یہاں ہر ہر چیز میں احتیاط کتنی ضروری ہے۔

ائیرپورٹ کی بس میں بیٹھ کر جہاز کی طرف روانہ ہوئے تو قاری عبدالرحمان رحیمی صاحب(۱)، ہم جس مزار پر پہنچتے تو قاری صاحب بہت عمدہ تلاوت فرماتے، پھر اس کے بعد دعا شروع ہو جاتی، وہاں کے لوگ ان کی تلاوتیں سنتے رہے، لیکن جب ہم مدرسہ میر عرب (عالیہ) پہنچے تو مدرسہ کے بعض اساتذہ اور طلبہ نے دوبارہ قاری عبدالرحمان صاحب سے تلاوت کی درخواست کی، جس پر انہوں نے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ...الآية [فرقان: ٦٣]﴾ سے آخر تک

---

(۱) قاری عبدالرحمان رحیمی صاحب قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، تلاوت بہت عمدہ کرتے ہیں، جسم پر ایک کپڑے کا جبہ اوڑھے ہوئے، ماشاء اللہ پچپن سال کی عمر میں سر اور داڑھی کے بال اپنی حالت پر برقرار ہیں، سر پر مخصوص ٹوپی سجائے اس بزرگ کو دیکھ کر ابتداً معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون ہیں اور ان کی کیا صفات ہیں؟ لیکن جب انہوں نے تلاوت شروع کی اور مجمع پر اس کا اثر دیکھا تب ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا۔

تلاوت کی اور سامعین کے دل کو خوب گرمایا۔

بہت خوش طبع انسان تھے، ہمیں تو ان سے زیادہ گپ شپ کا موقع نہ مل سکا، لیکن دوران سفر بس میں کبھی کبھار ان کے لطیفے چھٹکلے سننے کو مل جاتے، کہیں پر ایک دو ظریفانہ جملے بھی کہہ جاتے تھے، اللہ تبارک وتعالی نے بہت خوبصورت آواز سے نوازا ہے، جب بھی کوئی ان کی تلاوت کی تعریف کرتا تو ایک جملہ کہتے کہ: ''یہ سب میرے استاد قاری رحیم بخش صاحب کا فیض ہے اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، مجھ جیسے دیہاتی انسان کو بھی اس لائق بنایا کہ آج قرآن پڑھ لیتا ہوں''، اپنے استاد سے بے حد محبت کرتے ہیں، جہاں بھی ان کی تعریف ہوتی فوراً استاد کا تذکرہ کرکے اپنی وفا اور محسن کے شکریہ کو سامنے رکھتے تھے، اللہ تعالی ان سے امت کو خوب فائدہ پہنچائیں اور ہر قسم کے شرور و فتن سے ان کی ان کے مدرسہ ادارے کی حفاظت فرمائیں۔ آمین

قاضی ارشد الحسینی صاحب[1]..

---

(۱) قاضی ارشد الحسینی صاحب دامت برکاتہم العالیہ مولانا قاضی زاہد الحسینی صاحب رحمہ اللہ (چراغ محمد کے مصنف) کے صاحبزادے ہیں، قاضی زاہد الحسینی صاحب رحمہ اللہ مولانا حسین احمد رحمہ اللہ کے قدیم تلامذہ میں سے تھے، حضرت مدنی رحمہ اللہ سے خوب محبت کرتے تھے، حضرت مدنی رحمہ اللہ نے بھی محبتوں اور شفقتوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، خوب محبت دی، محبت کی جس کی ایک جھلک ان کی کتاب چراغ محمد میں خوب ظاہر ہوئی، دل سے لکھی گئی یہ کتاب خوب مقبول ہوئی اس کے کئی ایڈیشن چھپ کر ختم ہوئے، حضرت مدنی سے یہ محبت ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوئی، چنانچہ قاضی ارشد الحسینی صاحب کی نسبت بھی الحسینی حضرت مدنی رحمہ اللہ کے نام سے ہے، قاضی صاحب بھی حضرت مدنی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، پنجاب (گوجرانوالہ) میں ایک تقریب میں فرمانے لگے کہ یہاں پر اس لیے آیا کہ جب پتہ چلا کہ حضرت مدنی کے شاگرد مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب تشریف لارہے ہیں تو میں بھی چلا آیا، حضرت مدنی رحمہ اللہ کے کسی بھی شاگرد کے بارے میں معلوم ہوتا فوراً پہنچ جاتے ہیں، اولاد کو بھی حضرت مدنی رحمہ اللہ کی محبت اسی طرح سکھار کھی ہے۔

حضرت مدنی ہی کی نسبت سے استاد محترم سے بھی بہت محبت فرماتے ہیں، حج کے موقع پر بھی دوبار استاد محترم سے ملنے تشریف لائے، اپنی کتاب ''دیار مدنی میں'' بھی پیش کی اور چراغ محمد بھی پیش کی جس پر استاد محترم نے تقریظ بھی مدینہ منورہ میں لکھی۔

قاضی صاحب پیر طریقت بھی ہیں اور اچھے خطیب بھی، خطابت کے جوہر سے پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگ خوب واقف ہیں، لیکن ان کی ظرافت سے شاید کم لوگ ہی واقف ہوں گے، مکہ مکرمہ میں بھی اپنی ظریفانہ باتوں کے ذریعے استاد محترم مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب کو ہنساتے رہے اور ابھی ازبکستان کے سفر میں بھی شرکاء سفر ان کی ظریفانہ باتوں ان کے لطائف سے خوب محظوظ ہوتے رہے، جو بھی بات ہوتی تھی قاضی صاحب کو اس پر قصہ یاد آجاتا تھا، ایسے برملا قصوں کا موقع مناسبت سے یاد آجانا قاضی صاحب پر اللہ کی خوب عطا ہے۔

مولانا عبد اللہ شاہ مظہر صاحب[1] کی ظریفانہ باتیں شروع ہوئیں، وقت تو یہ بہت کم تھا، لیکن بس شاید ائیر پورٹ میں کافی گھومی جس پر بعض ساتھیوں نے از راہ مزاح یہ بھی کہا کہ شاید ترمذ بائے روڈ ہی جارہے ہیں، خیر اس دوران لطائف کی اچھی خاصی مجلس ہوگئی۔

مولانا عبد اللہ صاحب سفر کی ترتیب بننے کے بعد بیمار ہوئے ان کے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا، لیکن باہمت آدمی ہیں اس کے باوجود بھی سفر میں ساتھ شریک رہے، ان سے جب پوچھا تو کہنے لگے سفر تو ہوتے رہتے ہیں یہاں بھی دوبارہ آسکتے تھے، لیکن اتنے اکابر اور اتنے بڑے مجمعے کے ساتھ شاید دوبارہ آنا نصیب نہ ہوتا، اس لیے

قاضی صاحب سرپرستی تو کافی مدارس کی کرتے ہیں، لیکن ذاتی اہتمام شاید دو مدرسہ کی کرتے ہیں، ایک مدرسہ اٹک میں ہے، جب کہ دوسرا مدرسہ ایبٹ آباد میں ہے، اپنے اوقات کو دونوں مدرسوں کے لیے تقسیم کرر کھا ہے، کچھ عرصہ اٹک میں گزارتے ہیں تو کچھ عرصہ ایبٹ آباد میں گزارتے ہیں، مخصوص قسم کا عمامہ باندھتے ہیں، عموماجبہ زیب تن کیا ہوتا ہے، لباس وپوشاک میں ذوق رکھتے ہیں، عصا بھی خاص قسم کی ہر وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں، خطیبانہ مزاج، مقررانہ انداز ان کی ہر بات سے چھلکتا ہے، ان کی خوش مزاجی نے انہیں خوب زندہ دل بنا رکھا ہے، پورے سفر استاد محترم کے ساتھ بس کی اگلی سیٹ پر بیٹھے رہے، استاد جی کو بھی اور بس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی کوئی لطیفہ سنا کر خوش کرتے رہتے تھے، لیکن بات میں سچائی ہوتی تھی، بے ہودگی سے خود کو خوب بچار کھا تھا۔

ہوٹل میں بھی جس وقت نیچے پہنچنے کو کہا جاتا تو قاضی صاحب اور مولانا عزیز الرحمان رحمانی صاحب کو ہمیشہ وقت پر اس جگہ موجود پایا، قاضی صاحب پیر صاحب سے گپ شپ بھی خوب ہے اور دوستی بھی، نیچے لاؤنج میں بیٹھ کر ان کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے رہتے تھے، اس کے علاوہ اس سفر میں قاضی صاحب کو مولانا شیر جان صاحب سے بھی گپ شپ کرتے ہوئے خوب پایا ہے، ہمیشہ دونوں ہی کوئی چھٹکلا پیش کیا کرتے رہتے تھے، قاضی صاحب اپنے ساتھ ائیر پورٹ پر سب شرکاء کے لیے ہدایا بھی لائے تھے، جس میں کتابیں اور خشک میوہ جات کی ایک تھیلی بھی تھی، جس سے دوران سفر ازبکستان ساتھیوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور بار بار اسے کھول کر اپنی بھوک کو مٹایا کرتے تھے، قاضی صاحب مولانا عزیز الرحمان صاحب کے سفر کے پرانے ساتھی بھی ہیں جس کا تذکرہ انہوں نے کئی جگہ پر کیا بھی ہے۔

(۱) علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے خانوادے کے ہیں، یہ پورا خانوادہ علمی ہے، جہادی سرگرمیوں میں اکثر وبیشتر شریک رہے ہیں، ان کے بڑے بھائی مفتی ابولبابہ صاحب دامت برکاتہم ہیں، جو آج کل زیادہ وقت ترکی میں گزارتے ہیں، مفتی ابولبابہ صاحب ہوں یا مولانا عبد اللہ شاہ مظہر صاحب ایک چیز جو مشترک دیکھی وہ ان حضرات کی تواضع ہے، ان کی انکساری واقعۃً محبوب ہے، ان کی دینی خدمات اور ان کے طور طریقے سے کوئی موافق ہو یا نہ ہو اتنا ضرور ہے کہ ملنساری ان میں بہت ہے، مجمع سے گھل مل جانا، خود کو کچھ نہ سمجھنا، نوجوانوں کے دلوں میں اتر کر بات کرنا، پھر رفقاء سفر کا خیال رکھنا، انہیں یاد رکھنا، ان کی یہ صفات بندہ کو بہت پسند آئیں، اللہ پاک ان کی صفات حمیدہ میں مزید برکتیں نصیب فرمائیں اور ہر قسم کے شرور وفتن سے ان کی حفاظت فرمائیں۔

چلا آیا ہوں، اس آپریشن کے باوجود بھی یہ سفر میں ہر جگہ پہنچے اور خصوصا ان کی گپ شپ اور خندہ روئی میں کوئی فرق ہم نے محسوس نہیں کیا، ابتداء تو چونکہ سفر پہلی مرتبہ تھا اس لیے رائے کچھ نہ تھی، لیکن جب سفر ہوا تو ان کے سفر کا ساتھی ہونے کے بارے میں رائے بدل گئی۔

جہاز میں بیٹھ کر ترمذ کے لیے روانہ ہوئے، تاشقند سے ترمذ جہاز کا سفر تھا، بہت اچھی سروس تھی، اور اس کے ساتھ ہم ترمذ ائیر پورٹ تک پہنچ گئے، یہاں بھی ہم وی آئی پی لاؤنج میں لے جائے گئے، جب وی آئی پی لاؤنج پہنچے تو پتہ چلا کہ یہاں کے نائب گورنر اور مفتی اعظم بمعہ میڈیا کے استقبال کے لیے موجود ہیں، اولا تو ہم بھی باہر نکل آئے لیکن وہاں چونکہ میڈیا سے گفتگو ہو رہی تھی اس لیے مناسب سمجھا کہ استاد محترم کو بٹھا دیا جائے تاکہ تکلیف نہ ہو، میڈیا سے مولانا رضوان عزیز صاحب اور مولانا طلحہ رحمانی صاحب اور دیگر حضرات گفتگو کر رہے تھے، باقی حضرات بھی ان کے ساتھ کھڑے تھے، بندہ استاد محترم کے ساتھ، مفتی حسن صاحب، مولانا یاسر عبد اللہ صاحب کے ساتھ اندر لاؤنج میں آکر دوبارہ بیٹھ گئے، اس دوران نائب گورنر اور دیگر حضرات کے ساتھ ان کی گفتگو ہوئی اور اس کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہو کر پہلے کھانا کھانے کے لیے ہوٹل پہنچے۔

ترمذ میں پہنچ کر ہمیں پہلے کھانا کھانے ہوٹل جانا تھا، یہاں ائیر پورٹ سے روانگی کی صورت یہ تھی کہ ہم بس میں سوار تھے ہم سے آگے پولیس کی گاڑی تھی، اس کے ساتھ مفتی اعظم کی گاڑی تھی، اور پیچھے ایمبولینس تھی، ہوٹل پہنچ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ ازبکی کھانے کا انداز کیا ہوتا ہے۔

صبح کا ناشتہ تو ہمارا ہوٹل گولڈن ویلی ہی میں تھا، جس میں طرح طرح کی چیزیں موجود تھیں، ہوٹل فور اسٹار تھا، اس لیے باوجود اس کے کہ کچھ اشیاء ازبکی خاص ڈشیں تھیں، لیکن فور اسٹار ہونے کی وجہ سے عام طور پر جو مشترک چیزیں ہوتی ہیں وہی چیزیں یہاں بھی موجود تھیں، اس لیے ہمیں ازبک کھانوں اور طرز طعام کے بارے میں پتہ نہ چل سکا تھا، اب دوپہر پہلی بار کسی ازبک ہوٹل میں ازبک طرز سے ازبک کھانے کا موقع مل رہا تھا، اس لیے انتظار بھی شدت سے تھا۔

ازبک کھانے اور طرز تناول:

ہوٹلوں کی کیفیت جو بھی ہو، اگر آپ لب سڑک فٹ پاتھ پر بھی بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہوں لیکن اس میں اس قوم کی انداز و ثقافت جھلکتی ہو تو آپ کو بالکل بھی یہ محسوس نہیں ہوگا کہ آپ کہاں بیٹھے کھا رہے ہیں، اس لیے ہوٹل کے محل وقوع سے زیادہ اعتنا نہیں کروں گا، لیکن ان کا طرز طعام، ان کے پیش کرنے کا انداز، ان کے کھانے کے لیے بے حد اہتمام شاید ایک خاص چیز ہے جس کو بیان کرنا قارئین کرام کی دلچسپی کا سبب ہوتا، اگرچہ دنیا میں صرف کھانا پینا اصل نہیں، نہ دنیا میں اس مقصد کے لیے آئے ہیں، نہ ہی اس سفر نامہ میں ان چیزوں کا بیان مقصود ہے، فقط ان کے طرز و انداز کے ذکر کے لیے ہی یہ باتیں ذکر کی جا رہی ہیں۔

ہوٹل سادہ سے طرز کا بنا ہوا تھا، جس میں سلیقے سے ٹیبلیں اور کرسیاں بچھیں ہوئیں تھیں، ہمارے آنے سے پہلے ہی گروپ کے حضرات نے کھانے کا آرڈر کر دیا تھا، ہمارے لیے کرسیوں کا بندوبست ہو چکا تھا، اور جگہ کو مکمل تیار رکھا گیا تھا، ہم جب پہنچے تو ہاتھ دھو کر ٹیبلوں پر آبیٹھے، بندہ، استاد محترم حضرت چشتی صاحب، مولانا یاسر عبداللہ صاحب، مولانا عمران صاحب کی معیت میں ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا، ٹیبلوں پر لوگوں کے آنے سے پہلے ہی برتن وغیرہ سجا دیئے گئے تھے، بلکہ اس ہوٹل میں ہمارے آنے سے پہلے ہی سلاد بھی رکھا جا چکا تھا، ہمارے پہنچتے ہی یہاں ہم نے سلاد لینا شروع کی، یہ سلاد ان کے کھانے کا سب سے اہم جز ہوتا ہے، جو آپ کو ازبکی ہر کھانے سے پہلے ضرور کھانا یا دیکھنا پڑتا ہے، اس سلاد میں طرح طرح کی سبزیاں ہوتی ہیں، کچھ تو ہم نے پہچان لیں کچھ کو ہم آخر تک پہچان بھی نہیں پائے، لیکن چونکہ سبزیوں میں حلال حرام کا مسئلہ تب آتا ہے جب اس پر کیمکل کا معاملہ درمیان میں آجائے ورنہ تو سبزیاں سب ہی حلال ہیں، اس لیے سبزیوں کے معاملے میں تحقیق کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیونکہ سبزیاں اور پھل اس ملک میں وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں کیمیکل کے الجھن میں پڑنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

سلاد میں کھیرا، گاجر، چقندر، زیتون، پیاز، ٹماٹر، سلاد کے پتے، تو ہم پہچانتے تھے، لیکن چقندر کی طرح کے ہلکے گلابی رنگ کی جو چیز تھی وہ ہم پہچان نہ پائے، اس لیے کھانے میں احتیاط بھی کرتے رہے لیکن آخر تک اسی سوچ میں تھے کہ یہ ہے کیا چیز؟ غرض طرح طرح کی چیزیں ان کے سلاد میں رکھی رہتی تھیں۔

کھانے میں سب سے پہلے سلاد پیش کرتے ہیں، اس کے بعد اس کے بعض برتن اٹھا کر سوپ لایا جاتا ہے، جو ہم نے پورے ملک میں مختلف چیزوں کا ہی دیکھا، کسی میں صرف گاجر، پیاز، ٹماٹر اور گوشت ہوتا، کسی میں کچھ اور ہر جگہ یوں سمجھیں کہ مختلف قسم ہی کا سوپ کھایا ہے، سوپ کے بعد پھر اس کے برتن اٹھائے جاتے، پھر دوسرے برتن رکھے جاتے، جس میں کھانا پیش کیا جاتا، کھانے میں خوراک زیادہ نہیں ہوتی تھی، بس اس کے پیش کرنے میں وقت زیادہ صرف ہوتا، جس سے ہم پاکستانی زیادہ مانوس نہ تھے۔

ازبک کھانوں کی خصوصیات:

ازبکستان میں کھانوں کے متعلق بندہ کی درج ذیل رائے بنی (اگرچہ ہر شخص کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں، کیونکہ دنیا میں خوبصورتی کا بقا اختلافِ اذواق سے ہے)۔

ان کی وہ صفات جو بندہ کو اچھی لگیں:

۱- کھانوں میں بھاری اور ہلکے کھانے کا خیال رکھنا۔

۲- سبزیاں جو انسانی جسم کے لیے بہت ضروری ہیں انہیں کثرت سے استعمال کرنا۔

۳- کھانے بہت زیادہ چکناہٹ والے استعمال نہ کرنا۔

۴- کھانوں میں اور اس کے برتنوں میں صفائی کا خصوصی خیال رکھنا۔

۵- کھانے میں ترتیب کا خصوصی خیال رکھنا (مثلاً: پہلے سلاد سبزیاں، پھر سوپ، پھر اس سے بھاری چیز، پھر اس سے بھاری، تاکہ معدہ پر بھاری چیز فوراً اثر انداز ہو کر نقصان نہ دے)۔

۶- سبزیوں کے ساتھ فروٹ کا بھی وافر مقدار میں موجود ہونا۔

۷- سبز چائے کو کثرت سے استعمال کرنا جو جسم کے لیے بے حد مفید ہے۔

اس کے علاوہ جو چیز بندہ کو عجیب لگی وہ ان کا کھانے میں بہت زیادہ وقت صرف کرنا ہے، کھانے پر جو وقت لگے انہیں اس وقت کی پرواہ نہیں ہوتی، ہمارے راہبر بھائی سنجار صاحب جب بھی اترتے تو بہت ادب کے ساتھ اور کبھی ہمیں ہمارا فائدہ بتاتے ہوئے کہتے تھے کہ "یہاں اتنا ٹائم لگے گا، اگر آپ لیٹ ہوتے ہیں تو ہم

سے "موزولیم" رہ جائے گا"، لیکن کبھی کھانے کے وقت ان کو نہیں دیکھا کہ انہوں نے یہ کہا ہو کہ کھانا جلدی کھالیں! ہمیں دیر ہو رہی ہے، بلکہ بعض اوقات اس کے برعکس ہوا ہے کہ بعض ساتھیوں نے اس بات پر تنبیہ کی کہ کھانے پر اتنا وقت لگ جاتا ہے، انہیں کہیں کہ جلدی کریں، بہر حال! ہم اپنے حساب سے کہہ رہے تھے اور ازبک قوم کا کھانے کے بارے میں اپنا انداز تھا، اس لیے کہ وہ کھانے کو بہت فرصت اور دماغی بوجھ لیے بغیر کھاتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر اسی پروٹوکول (۱) میں حکیم ترمذی رحمہ اللہ کے مزار کے لیے روانہ ہوئے جو شہر سے کافی دور دیہات میں ہے، بلکہ ازبکستان اور افغانستان کے بارڈر کے بالکل قریب ہے، رستہ میں جب دیہاتی علاقہ شروع ہوا تو دریا آمو (۲) کے ساتھ ساتھ چلتی سڑک پر دور سے دریائے آمو کا نظارہ ہوتا رہا، اور ہم

---

(۱) جس کی ہمیں چاہ نہیں تھی اور نہ ہی ہونی چاہیے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ انسان کی حفاظت فرمائے کہ وہ پروٹوکول کا شوقین یا خواہشمند ہو ؛کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہو جائیں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے، شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے، جس کی وضاحت امام ابو سلیمان خطابی رحمہ اللہ نے یہ کی ہے کہ ممنوع اس وقت ہے کہ جب اس شخص نے حکم دیا ہو، یا یہ تکبر وغیرہ کے لیے ہو یا یہ شخص اس کو چاہتا ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں تب ممنوع ہے اگر اپنی چاہت نہ ہو اور لوگ علم یا علماء کے لیے کھڑے ہو جائیں تو اس میں حرج نہیں ہے امام بیہقی کے الفاظ یہ ہیں:

" عن معاوية : أن النبي صلى الله عليه و سلم قال : من أحب أن يمثل له الرجال قياما فليتبوأ مقعده من النار .

قال : أبو سليمان الخطابي رحمه الله في معنى هذا هو أن يأمرهم بذلك و يلزمه إياهم على مذهب الكبر و النخوة و قوله : يمثل معناه يقوم و ينتصب من بين يديه قال : و في حديث سعد دلالة على أن قيام المرء بين يدي الرئيس الفاضل والوالي العادل وقيام المتعلم للعالم مستحب غير مكروه قلت : وهذا القيام يكون على وجه البر والإكرام كما كان قيام الأنصار لسعد و قيام طلحة ـ لكعب بن مالك و لا ينبغي للذي يقام له أن يريد ذلك من صاحبه حتى إن لم يفعل حنق عليه أو شكاه أو عاتبه- (شعب الايمان: [٦/ ٦٩].

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر ان چیزوں کی چاہت ہو تو ممنوع ہے، اگر چاہت نہ ہو تو منع نہیں۔

(۲) جسے دریائے جیجون بعض حضرات کے مطابق احادیث مبارکہ میں فرمایا گیا ہے، اور جیجون اور سیحون کے بارے میں یہ روایت بھی بعض حضرات نے نقل کی ہے کہ یہ جنت کے دریاؤں میں سے ہے۔(مسند بزار)، لیکن دیگر بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ احادیث

ترمذ کے ایک دیہی علاقے کی طرف رواں دواں تھے، کیونکہ ہمیں نوادرالاصول کے مصنف "حکیم ترمذی رحمہ اللہ" (متوفی ۲۱ صفر ۲۵۵ھ)[1] کے مزار پر حاضری دینی تھی، حکیم ترمذی رحمہ اللہ یہاں کے لوگوں میں "بابا" یا "کسانوں کا باپ" کے نام سے مشہور تھے، ان کا مزار شہر سے کافی دور واقع ہے، مزار میں تعمیراتی کام کیا

مبارکہ میں جیحان اور سیحان کا تذکرہ ہے جیحون اور سیحون کا نہیں، امام دانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الفتن للدانی" میں بھی جیحون سیحون کا لفظ ذکر کیا ہے، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی الدیباج میں اس بات کو ذکر کیا ہے کہ جیحون اور جیحان دو الگ الگ نہریں ہیں، اور امام نووی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کر کے بھی اس بات کو ذکر کیا ہے کہ وہ دونوں کے ایک ہونے کے قائل نہیں تھے۔

مسند بزار والی روایت میں بھی یحیی بن کثیر اکیلے ہی اس روایت کو شعبہ عن خبیب بن عبد الرحمن عن حفص عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں، اس کے علاوہ کوئی اس طرح نقل کرنے والے نہیں ہیں۔

یہ آمو دریا وسط ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے پامیر کے پہاڑوں سے نکلنے والے اس دریا کی کل لمبائی ۲۴۰۰ کلومیٹر (۱۵۰۰ میل) ہے اور یہ افغانستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان سے ہوتا ہوا بحیرہ ارال میں گرتا ہے اس میں پانی کا سالانہ اخراج ۵۵ مکعب کلومیٹر ہے۔

اس دریا کو افغانستان اور تاجکستان، افغانستان اور ازبکستان اور افغانستان اور ترکمانستان کے درمیان سرحد قرار دیا گیا ہے۔

(۱) حکیم ترمذی رحمہ اللہ کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن علی بن الحسن بن بشر حکیم ترمذی تھا، کنیت: ابو عبد اللہ تھی، آپ کا شمار اکابر صوفیا میں ہوتا ہے، آپ نے اپنے والد، قتیبہ بن سعید، صالح بن عبد اللہ ترمذی، علی بن حجر سعدی، یعقوب دورقی اور دیگر ائمہ سے اکتسابِ علم کیا۔

مشائخ واولیاء میں آپ بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ صاحب تصنیف بزرگ تھے، حدیث پر عبور تھا، آپ کی تصانیف میں سے ختم الاولیاء، "نوادر الاصول من احادیث الرسول" اور "الریاضۃ وادب النفس" تو یادگار زمانہ کتابیں ہیں، آپ نے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھنا شروع کی مگر مکمل نہ کر سکے۔ ابتدائی زمانہ میں ایک ساتھی طالب علم کے ساتھ طلب علم میں روانہ ہوئے اپنی والدہ سے اجازت حاصل کی، والدہ رو پڑیں اور کہنے لگیں مجھے کس کے حوالے کرتے جا رہے ہو؟ یہ بات آپ کے دل پر اثر انداز ہوئی، سفر کا ارادہ ترک کر دیا، آپ کے ساتھی روانہ ہو گئے پانچ ماہ گزر گئے مگر طلب علم اور حکم والدہ کی کشمکش باقی تھی، ایک دن قبرستان میں بیٹھے تھے کہ زار زار رو رہے تھے اور افسوس کر رہے تھے کہ میں نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیا ہے، میرے دوست عالم فاضل بن کر واپس آئیں گے میں ان کے سامنے جاہل اور شرمسار رہوں گا ناگاہ ایک نورانی شکل نمودار ہوئی اور فرمانے لگے علم کے حصول کے لیے یہ بے قراری واقعی قابلِ قدر ہے، میں ہر روز یہاں آیا کروں گا اور تمہاری علمی تشنگی دور کرتا رہوں گا تم اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہیں رہو گے، آپ نے کہا یہ تو آپ کی عنایت ہو گی، چنانچہ اس بزرگ نے آپ کو لگاتار تین سال تک پڑھایا، یہ ساری محنت اور عنایت ان کے شوقِ علم اور خدمتِ والدہ کے صلے میں تھی، حقیقت میں یہ استاد بزرگ حضرت خضر تھے، تعلیم مکمل ہونے کے بعد حضرت خضر ہفتہ وار تشریف لاتے اور اپنے شاگرد کی مجلس کو تازہ فرماتے۔

حکیم ترمذی رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ دو الگ الگ حضرات و شخصیات ہیں عام طور پر ان کے معاملہ میں لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے، حکیم ترمذی محمد بن علی ہیں اور امام ترمذی مشہور امام حدیث ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ السلمی الترمذی (ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ)، ہیں جو جامع الترمذی اور الشمائل النبویہ کے جامع اور مرتب ہیں۔ (وکی پیڈیا)

گیا ہے، سب سے پہلے جا کر وضو وغیرہ کر کے ان کے مزار پر حاضری دی، گروپ نے طے کر رکھا تھا، کہ مولانا ادریس سومرو صاحب [۱] حکیم ترمذی رحمہ اللہ سے متعلق کچھ بات ذکر کریں گے، اس لیے انہوں نے ان سے متعلق کچھ باتیں ذکر کیں، اس دوران مفتی اعظم اور نائب گورنر بھی ہمارے ساتھ موجود تھے، بیان کے بعد بعض حضرات نے استاد محترم مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم سے نوادر الاصول کی اجازت چاہی، استاد محترم نے اجازت دینے سے انکار کیا اور فرمایا اجازتیں تو بڑی کتابوں کی لی جاتی ہیں، اس کتاب کا حدیث کی کتابوں میں کوئی خاص درجہ نہیں اس کی اجازت کا کیا فائدہ، ساتھیوں نے قائل کرنے کی کوشش کی، ایک ساتھی نے یہ بھی کہہ دیا "حضرت آپ نے فوائد جامعہ میں اس کتاب کو تیسرے درجہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے"، استاد محترم نے فرمایا: "اچھا آپ کہہ رہے ہیں مجھے تو یہ یاد نہیں، میرے خیال میں وہ جواہر الاصول

---

(۱) مولانا ادریس سومرو صاحب جامعہ دارالعلوم کراچی کے فاضل اور مخطوطات اور کتب پر اچھی نظر رکھنے والے عالم دین ہیں، اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہے، کئی کتب خانوں کی فہرست بھی تیار کی ہے، دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی جاتے ہیں مخطوطات اور کتب کے ذخیرہ جمع کرتے ہیں، کتابوں کے بارے میں بہت فیاض ہیں، تخصص کے زمانے میں بھی جب مخطوطات کا حصول آسان نہ تھا اور ڈالروں پر ترکی والے حضرات اس کے صفحات کی پی ڈی ایف بھیجا کرتے تھے، اس زمانے میں بھی مولانا ادریس سومرو صاحب کی طرف سے ایک طویل فہرست مخطوطات کی موجود تھی کہ جس طالب علم کو بھی اس میں سے کسی مخطوطہ کی ضرورت ہو وہ رابطہ کرے، بندہ کو ایک مضمون کے سلسلے میں صحیح مسلم کے مخطوطات کی ضرورت تھی بہت فیاضی دکھائی اور ایک کے بجائے کئی مخطوطات بندہ کو عنایت فرمائیں۔

ان کے پندرہ دن اپنے علاقے کنڈیارو کے مدرسہ میں اور پندرہ دن کراچی کی جامعہ عمر میں گزرتے ہیں، بہت تواضع والے انسان ہیں، علم دوستی کا یہ عالم ہے کہ سندھ کے جس کتب خانہ میں جانا ہوا مولانا ادریس سومرو صاحب کا بھجوایا ہوا کوئی مخطوطہ نظر ضرور پڑا، اور اس فیاضی میں مسلکی فرق سے بالاتر ہو کر ہر علم دوست شخص ان کے فن مخطوطات اور ذوق انتخاب سے محظوظ ہوتا رہتا ہے، بہت کم لائبریریاں ایسی ہوتی ہیں جن میں جانے کے بعد ہمیشہ کچھ نیا دیکھنے کو ملے ان لائبریریوں میں سے ایک لائبریری مولانا ادریس سومرو صاحب کی بھی ہے، جب کبھی ان کی لائبریری جانا ہوا ضرور کچھ نئی کتابیں نئی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں، کسی طالب علم، عالم و محقق کو کتاب کی ضرورت ہو تو ان کے لیے ہمہ وقت حاضر رہنے والے مولانا ہیں۔

ان کے مکتبہ میں ماشاء اللہ بیک وقت ان کے والد، خود انہیں، ان کے بیٹوں اور پوتوں کو موجود دیکھا، کوئی تصنیف و تالیف میں مصروف تھا تو کوئی جلد سازی اور نقش و نگار کتب میں، جب مولانا سے پوچھا تو فرمانے لگے والد صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص کتابوں کے معاملہ میں بخل کرے گا اللہ ان کی اولاد کو علم سے محروم کریں گے۔ اور ہم نے اس سلسلے میں بخل نہیں کیا تو الحمد للہ آج سب ہی اس رستہ میں لگے ہیں اور مصروف ہیں۔

ہے"۔[۱]

بہر حال استاد محترم نے اس کتاب "نوادرالاصول" ضعیف روایتوں کی کثرت کی وجہ سے اس کی اجازت نہیں دی، جب باہر نکلے تو مولانا شیر جان صاحب فرمانے لگے: "حضرت آپ نے دل خوش کر دیا، میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایسے موقع پر ہمارے علماء کا کیا عمل ہے؟ کیا ہر کتاب چاہے وہ جیسی بھی ہو اس کی اجازت دے دیتے ہیں یا اس کی اجازت دینے میں احتیاط کرتے ہیں؟"۔

---

(۱) بعد میں وہ ساتھی جب کراچی تشریف لائے تو استاد محترم سے فرمایا: "حضرت آپ نے جیسا فرمایا تھا کہ وہ جواہر الاصول ہے، معاملہ اسی طرح ہے، فوائد جامعہ میں تیسرے درجہ کی کتابوں میں نوادرالاصول نہیں، بلکہ "جواہر الاصول" کا تذکرہ ہے۔

اس سے استاد محترم کی چند باتیں سامنے آئیں:

۱-الحمد للہ استاد محترم عمر کی نوے دہائیاں پوری کرنے کے باوجود اب تک تلقین قبول نہیں کرتے، اگر کسی بات کے بارے میں فی الوقت ذہن میں نہ آرہا ہو تو اپنی طرف سے رائے نہیں دیتے، نہ ہی لوگوں کی رائے کو بغیر تحقیق کے اپنی طرف منسوب کرتے یا ہونے دیتے ہیں۔

۲-اس عمر میں بھی الحمد للہ حافظہ اس قدر ہے کہ بات بھولے نہیں۔

۳-دوسرے کی رائے کو رد کرنے میں جلدی بھی نہیں کرتے، اور رد کرنے میں شدت اختیار نہیں کرتے، بلکہ نرمی سے بات سن کر تواضعا یہ ارشاد فرماتے "حضرت میرے علم میں تو ایسا نہیں، دیکھ کر بتاؤں گا"، بندہ کے ساتھ بھی ایسا معاملہ ہوا کہ استاد محترم کی ایک تحریر پروف ریڈنگ کے لئے بندہ کے پاس موجود تھی، جس میں ایک فارسی شعر تھا:

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

استاد محترم کے احتیاط و تواضع کا یہ عالم ہے کہ جس لفظ شک ہوتا وہ مختلف طلبہ کو دکھا کر اس کی تصحیح کے لیے فرماتے تھے، فارسی کا شعر تھا تو ہمارے کلاس کے ایرانی ساتھی کے پاس بھجوادی، بندہ نے اس ساتھی کو تصحیح کے لیے کاغذ دیا وہ اٹھا کر استاد جی کے پاس لے آئے اور کہنے لگے، فارسی میں "نے" کا لفظ ہے ہی نہیں، بندہ کو غصہ آیا کہ یہ کیا طریقہ ہے رد کرنے کا اور یہ کیسے اتنے مشہور شعر کو رد کر دیا، یہ بات بندہ نے اس ساتھی کو استاد محترم کی موجودگی میں ذکر کی، لیکن لہجہ میں شاید سختی تھی، استاد محترم نے بھانپ لیا، بندہ کو خاموش رہنے کے لیے فرمایا اور اس طالب علم کو فرمانے لگے: "حضرت جیسا آپ صحیح سمجھتے ہیں ویسا لکھ لیجیے"، وہ طالب علم اسی پرنٹ شدہ کاغذ پر لکھنے لگے، بندہ کی منع کرنے پر دوسرا کاغذ استاد محترم نے ان کو دے کر فرمایا کہ اس پر لکھ لیں، وہ لکھ کر چلے گئے، استاد محترم بندہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: "میاں غصہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر کوئی تمہاری تحریر پر اعتراض کرے تو خوش دلی سے سن لو، اپنے پاس نوٹ کر لو اگر ان کی بات صحیح ہوئی تو آپ ہی کا فائدہ ہے وہ آپ کا محسن ہے، اس کا شکریہ بھی ادا کرو اور اگر غلط کہہ رہا ہو تو آپ کو مزید تحقیق کا موقع مل جائے گا، غصہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔

چلہ خانے یا زیر زمین مدارس:

مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد جب ہم باہر نکلے تو گائیڈ نے ہمیں اس مزار کے پاس بنے ہوئے "چلہ خانے" دکھائے، استاد محترم اور دیگر بزرگ حضرات کو وہیں قریب بنے بنچوں پر کچھ دیر کے لیے بٹھا دیا گیا اور ہم نیچے چلہ خانوں میں اترے، اگرچہ استاد محترم ہر جگہ جانے میں ہم سے زیادہ چست رہے، لیکن ان جگہوں کی بناوٹ اور ان زیر زمین مدرسوں میں اترنے کے راستوں کے خطرناک ہونے کی وجہ سے ان حضرات کو بنچوں پر بٹھانا لازمی تھا۔

یہ چلہ خانے ان ازبک حضرات کے بقول ان صوفیاء کے مراقبوں کے لیے بنائے گئے تھے، لیکن درحقیقت یہ وہ زیر زمین مدارس تھے، جنہیں ازبک غیور مسلمانوں اور علماء نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے بنا رکھا تھا، جس میں چھوٹے معصوم بچوں کو اور بڑے پڑھنے والوں کو علم دین سکھایا جاتا تھا، اور قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی تھی، انہیں علم دین سکھایا جاتا تھا، اور یہ سب کچھ روس کے زمانے میں ہوا، جب ازبک مسلمانوں پر آزمائش کا وقت آیا اور انہوں نے نہ صرف علم دین بلکہ علم دین کے ذرائع پر بھی پابندی لگائی، عربی الفاظ کے بولنے تک پر پابندی عائد کر دی، ازبک قوم کو دوسری دنیا سے مکمل طور پر کاٹ دیا، تاکہ کسی سے اختلاط کی وجہ سے کچھ سیکھ نہ لیں، اور عربی سیکھنے، سکھانے پر سزائیں دی جانے لگیں، بلکہ دین سکھانے کا پتہ چلنے پر قتل کیا جانے لگا، بچوں سے ان کے والدین کے بارے میں چھپکے چھپکے پوچھا جاتا اور دین کی طرف معمولی میلان کی وجہ سے بھی قتل تک نوبت آجاتی تھی، نمازوں کی اجازت کے بہانے لوگوں کے دینی رجحان کو معلوم کیا گیا اور ہزاروں افراد کو نماز پڑھنے کی وجہ سے شہید کیا گیا، عربی فارسی کو ختم کرنے کے لیے رشین زبان کو رائج کیا گیا ناموں تک میں عربی تلفظ ختم کرنے کے لیے رشین الفاظ کو ناموں کا جز لازم قرار دیا گیا، سب اس لیے کیا گیا تاکہ مسلمانوں سے اسلام کو ختم کیا جاسکے، ان کے دلوں سے اسلام اور قرآن وحدیث کے نقوش کو مٹا دیا جائے، ان کی نسلوں سے اس تصور کو ختم کر دیا جائے، ان میں کمیونسٹ اور دہریت کی روح پھونک دی جائے، انہیں اپنی طرح مادر پدر آزاد بنا کر اللہ تعالی سے دور کر دیا جائے، تاکہ نہ یہ دین ہو اور نہ دنیا میں روس کا کوئی دشمن ہو، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ:

فانوس بن کہ جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اس موقع پر، ایسے حالات میں، ان اندوہناک مناظر کو سامنے رکھ کر جس میں روس (اس وقت کے سپر پاور) نے اپنی پوری قوت کو بروئے کار لا کر دینی علوم کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا، ایسے مواقع پر اس وقت کے علماء نے پھر سے قربانی دی، پھر سے زیر زمین جا کر اپنے اور اپنے بچوں کے دین کی حفاظت کے لیے اپنے گھروں میں زیر زمین مدارس بنائے، کئی کئی مہینے تک گھر کے صحن تک کو نہیں دیکھا، اپنے ساتھ ضرورت کا سامان لے کر وہ ان مدرسوں میں چھپے رہے اور دین مبین کی جس قدر وہ کر سکتے تھے انہوں نے حفاظت کی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب روس یہ سوچ کر کہ ہم نے ان سے اسلام کو ختم کر دیا اور افغان مجاہدین کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر یہاں سے چلا گیا تو تصور یہی تھا کہ ان ممالک میں کوئی بھی قرآن وحدیث کا جاننے اور پڑھنے والا نہیں ہوگا، لیکن اس کے برعکس کئی کئی لوگ قرآن کریم کے حافظ بنے احادیث مبارکہ کو جاننے اور سمجھنے والے بنے، اسلام کو مٹانے کی خواہش رکھنے والے نہیں جانتے تھے:

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

چلہ خانوں کا منظر:

ان زیر زمین مدارس کو اندر سے دیکھنے سے ایک ایسا رعب سا طاری تھا جیسا کہ اللہ تبارک وتعالی نے اصحاب کہف کے غار کے بارے میں فرمایا تھا:

﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَاراً وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا...الآية، [كهف: ١٨]﴾، لیکن وہی رعب بعض کے کھنچنے اور بعض کے دور جانے کا سبب ہوا کرتا ہے، رعب کے ساتھ ان زمین دوز مدارس میں جو جاذبیت اور محبوبیت تھی اس کا اندازہ کہنے سننے سے نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

یہ مدارس زمین کے اندر تھے اوپر کی طرف ایک چھوٹا سا سوراخ نما رستہ بنا ہوا تھا، جس میں بمشکل دو

افراد ایک ساتھ جاسکتے تھے، جس کے ارد گرد ازبک حکومت نے گرل لگا کر اس تاریخی ورثہ کو محفوظ کر لیا ہے، اس کے گرل کے ساتھ نیچے جانے کا راستہ ہے، جس میں نہ سیڑھیاں ہیں، نہ ہی ہموار زمین بلکہ پھسلنے والی مٹی سے بنی یہ زمین جس میں کچھ تھوڑی تھوڑی سی جگہیں راستوں کی طرح بنی ہوئی تھی اسی سے نیچے اتر کا اندر جانا تھا، یہ دکھنے میں کسی غار سے کم معلوم نہیں ہوتی تھیں، جب اندر گئے تو ایک عجیب سا منظر تھا، ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا، جس کا رقبہ شاید ۸۰ گز کے برابر ہو گا، جسے زیر زمین بنایا گیا تھا، انتہائی سادگی کا مظاہرہ کرنے والی یہ جگہ، جو اپنے رقبے کی قلت اور درجہ کی بلندی کی ایک اعلی مثال تھی، چیخ چیخ کر اس بات کو واضح کر رہی تھی اللہ کا یہ دین مٹنے کے لیے نہیں بلکہ غالب ہونے کے لیے آیا ہے۔

بقاء دینی کے اسباب:

یہاں ایک بات اور ملحوظ رہے کہ ضروری نہیں کہ صرف ان زیر زمین مدارس ہی کی وجہ سے دین بچا ہے، اور آئندہ اب اس طرح کے زیر زمین مدارس نظروں میں آنے کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پائیں گے، بلکہ یہ صرف حفاظت دین کا ایک مظہر تھا کہ اللہ تعالی نے اس طرح دین کی حفاظت کی ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ اس طرح سے دین کی حفاظت کریں گے، ہر جگہ ایک ہی ترتیب رہے گی یہ ہمارے خیال میں رہے، اللہ تبارک وتعالی نے اس دین کی حفاظت کا خود ذمہ لے لیا ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَه لَحَافِظُوْن...الآية،[سورة الحجر:٩]﴾، اب ان کی مرضی وہ جیسے بھی حفاظت فرمائیں، ہاں البتہ یہ ہماری سعادت ہوتی ہے کہ ہم اس خدمت میں استعمال ہو جاتے ہیں، بس اللہ تبارک وتعالی ہم سے محنت چاہتے ہیں باقی سب کام اللہ نے کرنے ہیں کیا چیز کس طرح بنانی ہے یا دین کی حفاظت کیسے کرنی ہے یہ اللہ کا کام ہے، اللہ نے موسی علیہ السلام کی حفاظت ان کے دشمن کے گھر میں کر کے دکھائی، جس کے لیے سینکڑوں بچوں کو قتل کیا وہی بچہ خود فرعون کے گھر میں پل کر اسی کی سلطنت کے خاتمے کا سبب بنا، یہ سب اللہ جل جلالہ کا کام ہے جس میں انسانی عقلیں کام کرنا چھوڑ جاتی ہیں۔

ازبکستان و افغانستان کی سرحد

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ حکیم ترمذی رحمہ اللہ کا مزار ایک دیہی علاقے میں ہیں، یہ دیہات دریائے آمو کے ساتھ متصل ہیں، جہاں پر دور سے ہی دریائے آمو نظر آتا ہے اور دریائے آمو کے ساتھ ہی افغانستان کا بارڈر ہے، یوں ہم دور ہی سے افغانستان کا نظارہ کرتے ہوئے گزر گئے، لیکن حکیم ترمذی رحمہ اللہ کے مزار کے ساتھ جب ہم زمین دوز مدارس کے دیکھنے سے فارغ ہوئے تو سامنے چھوٹی سے پہاڑی تھی، جسے خار دار تار لگا کر بند کر دیا گیا تھا، جو بعض حضرات کے مطابق پرانا ترمذ شہر تھا، ہم نے کوشش کی کہ اسے دیکھیں تو قریب جاتے ہوئے کسی مقامی شخص نے آواز لگا کر منع کر دیا کہ اس طرف مت جائیں یہ افغانستان کا بارڈر ہے اس طرف افغانستان کا حصہ ہے، ہم پیچھے ہوگئے اور دور سے ہی اس پہاڑی کو دیکھتے رہے جسے پرانا ترمذ شہر کہا جارہا تھا۔(تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ترمذی رحمہ اللہ کا مزار شہر کے اندر تھا جس سے یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ترمذ کا قدیم شہر یہی ہو؛ کیونکہ اس کی بناوٹ کسی شہر ہی کے ٹیلے کی طرح تھی جو شاید اس وقت کا بازار یا مکانات ہوں، لیکن کھنڈر بتا رہے تھے کہ لوگ یہاں رہے تھے، بالکل آج کی طرح کا ویرانہ نہیں تھا۔)

مقبرۃ السادات

حکیم ترمذی رحمہ اللہ کے مزار سے فارغ ہو کر ہم مقبرۃ السادات نامی جگہ پر گئے، جہاں بادشاہوں اور بعض سادات کی قبریں تھیں، جس میں بارہ کمرے تھے اور تقریبا ایک سو بیس حسینی سادات کی قبریں تھیں، اور اس جگہ پر بھی بہت خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی تھی، قبروں سمیت یہ جگہ خود بھی دیکھنے لائق تھی، اس مقبرۃ السادات کا احاطہ کافی بڑا تھا، جس میں باغیچے، درخت، اور خوبصورت رستے بنے ہوئے تھے، سیاحوں کی تصویر کشی کے لیے حکومت نے اس میں کافی جگہیں بنا رکھی تھیں۔

ہوٹل ایسون:Hotel asson

مقبرۃ السادات سے فارغ ہو کر ہم ہوٹل ایسون آگئے، جہاں پر ہماری رہائش تھی یہ تھری سٹار ہوٹل تھا [(۱)]، ہمارے رات کا کھانا بھی اسی ہوٹل میں تھا، اس ہوٹل میں اوپر جانے کے لیے لفٹ وغیرہ نہ تھی، لیکن نفاست سے بنا ہوا تھا، استاد محترم اور بندہ کو سب سے اوپر منزل پر کمرہ دیا گیا، بندہ نے جب بتایا کہ ہوٹل میں لفٹ نہیں ہے، تب انہوں نے تمام بزرگوں کو گراؤنڈ فلور ہی پر جگہ دی، دیگر جوان یا ادھیڑ عمر حضرات کو اوپر کی منزلوں میں کمرے دیئے گئے، اس مرتبہ کمروں کی تقسیم میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی؛ کیونکہ پہلے دن کی جوڑیوں سے کافی حد تک مسائل حل ہو گئے تھے، لیکن بہر حال سفر میں معمولی اونچ نیچ کا ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہوا کرتی۔

رات کا کھانا اسی ہوٹل میں طے تھا، وقت مقرر پر کھانا کے لیے پہنچنا تھا، چند گھنٹے کھانے کے لیے مخصوص کر رکھے تھے، کھانا کھانے کی جگہ بھی بہت سلیقے سے بنا رکھی تھی، ٹیبلوں اور کرسیوں پر سجایا گیا کھانا، ازبکی ذائقہ اور ازبکی طرز تناول سے پیش کیا جانے والا کھانا ہوتا تھا، نظافت و نفاست ازبک قوم کا عام معمول تھا، اس لیے اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

کھانا کھا کر ہم کچھ دیر کے لیے ٹہلنے نکل گئے، یہاں موسم میں تاشقند سے کچھ زیادہ خنکی تھی اس لیے آج سویٹر پہن کر ہی باہر نکلنا پڑا، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے موسم میں مزید ٹھنڈک پیدا ہوئی، آج کے دن بھی وہی کچھ صفائی ستھرائی، سکون، شور شرابہ کا نام ونشان نہیں، کشادہ سڑکیں، خاموش طبعیت لوگ، سلیقے سے بنی دکانیں، ثقافتی طرز کے بنے ریسٹورنٹ، اور عمومی سطح کے بنے مارکیٹ تھے، ہمیں آج کچھ دودھ خریدنا تھا جس کے لیے ہم ایک سپر سٹور کے پاس پہنچے، یہاں پر سٹور کے باہر ٹیکسی والے کافی تعداد میں کھڑے تھے اور پاکستان کے بس اسٹینڈ کے ٹیکسی والوں کی طرح سواریوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے، یہاں کچھ

---

(۱) ترمذ میں ٹورسٹ کا آنا جانا کم ہے کیونکہ یہاں تفریحی مقامات کم ہیں اس لیے یہاں ہوٹل بھی کم ہیں اور جو ہیں بھی تو وہ زیادہ بڑے نہیں ہمارا ہوٹل بھی اسی طرح کا تھا۔

لوگ پیچھے اس انداز سے بھی لگے جن کی زبان تو سمجھ نہیں آرہی تھی، لیکن انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مانگنے والے ہیں، اور بار بار کوئی جملہ کہہ رہے تھے جو ہم سمجھ نہیں پائے، اس وقت تک تو مانگنے والا ہونے کا واہمہ بھی نہیں ہوا، لیکن جب دیگر حضرات نے انہیں ڈانٹ کر ہٹنے کے لیے کہا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ہم سے پیسے مانگ رہے تھے اور انہوں نے ہٹایا ہے۔

سپر مارکیٹ کے اندر جا کر کچھ چیزیں خریدیں اور پیسے ادا کرنے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچے تو ان کی بات سمجھ نہیں آرہی تھی، اچھا یہ تھا کہ کیلکولیٹر ہمارے درمیان خاموش ترجمان موجود تھا، چنانچہ انہوں نے جو لکھا وہ ہم نے دیکھ کر انہیں قیمت ادا کی اور باہر نکل آئے، اب باہر ٹیکسی والے اسی طرح پہنچ گئے، کچھ کہتے رہے اور ہم سمجھ نہیں پائے اور آگے چل دیئے، اب سڑک عبور کر کے جب ہم اپنے ہوٹل کی طرف جانے لگے تو سڑک کے دوسری طرف سے پولیس کی گاڑی ہمیں دیکھتے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، بندہ کی نظر ان پر پڑی تو وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے، ہم تھوڑا آگے ہوئے تو وہ بھی آگے بڑھے جس سے معلوم ہوا کہ وہ ہمیں ہی نظر میں رکھے ہوئے ہیں، ہم ہوٹل پہنچے تو پولیس کی وہ گاڑی آگے چلی گئی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پولیس کی گاڑی در حقیقت ہمارے ہی حفاظت کے لیے تھی، رات ترمذ کے اس ہوٹل میں گزاری، آج بھی اللہ کا فضل، عافیت وصحت سب برقرار تھی، اللہ کا شکر ادا کر کے سو گئے صبح امام ترمذی رحمہ اللہ کے مزار پر حاضری دینی تھی

۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کا مزار

صبح سات بجے ہم ہوٹل سے نکل کر امام ترمذی رحمہ اللہ کے مزار کے لیے روانہ ہوئے، جو ترمذ شہر سے تقریباً ۶۰ کلو میٹر دور ہے، علاقے کا نام "شہر بود" ہے، بعض نے "شہر آباد" لکھا ہے، یہ سفر ہمارا بس میں ہوا، جس سے آگے ہمیں سمرقند جانا ہے، ترمذ سے دور یہ شہر آباد کا علاقہ، جس میں امام ترمذی رحمہ اللہ کا مزار ہے، کافی دور ہے، اس طرف جاتے ہوئے راستے میں ازبک قوم کی کم آبادی اور اس کے علاقے نظر آرہے تھے، ایسا لگتا تھا کہ ازبکستان میں لوگ ہے ہی نہیں، یہاں سارے لوگ یا گھروں میں محصور ہیں یا پھر اپنے کاموں میں

مشغول ہیں، جنہیں باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا، کہیں دور دور فاصلے پر کسی کھیت میں کام کرنے والے کچھ کسان نظر آتے تھے، ورنہ تو عوام خال خال ہی تھے، کہیں گھنے بالوں والے چھوٹے قد کے جانوروں (گائے، بکری، دنبہ) کو چرانے والے چھوٹی عمر کے چرواہے نظر آئے ورنہ تو کوئی نظر نہیں آیا، رستہ کٹتا رہا اور اس طرح ہم "شہر بود" میں امام المحدثین، صاحب السنن، نقل مذاہب کے ایک باوثوق ذریعے، امام بخاری اور دیگر محدثین کرام کے صحبت یافتہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے مزار پر انوار کے احاطے کے پاس پہنچے، جہاں ہمارے ساتھ موجود اکابر پاکستان کے استقبال کے لیے ریاست کے مفتی اعظم اور نائب گورنر موجود تھے، بس سے اترے تو یہ حضرات آگے بڑھے اور سب نے گروپ کے تمام افراد سے معانقہ کیا اور یہ ہمارے ساتھ احاطے کے اندر داخل ہوئے۔

احاطہ مزار:

اس احاطے میں صرف امام ترمذی رحمہ اللہ کی قبر ہی نہیں تھی، بلکہ قبر کے ساتھ اس احاطے میں داخل ہوتے ہی اندر:

۱- ایک دکان تھی، جس میں ٹوپی تسبیح اور دیگر ازبکی چیزیں ملتی تھی، بعض حضرات نے وہاں سے خریداری بھی کی۔

۲- اس کے بعد ایک اور عمارت بنی تھی جس میں امام ترمذی رحمہ اللہ کی قبر تھی، جو ایک کمرہ نما جگہ تھی، اسی کے ساتھ ایک اور ہال سا بنا تھا جس میں بنچ وغیرہ رکھے تھے، مزار پر حاضری دینے والے پہلے قبر کے پاس جاتے ہیں اور پھر ان بنچوں پر بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت کر کے دعا کرتے ہیں، پھر وہیں سے واپس ہو جاتے ہیں، یہ معمول تقریبا تمام مزاروں کا ہے۔

۳- اسی احاطے میں ایک کتب خانہ بھی تھا، جس میں کتابیں رکھی تھیں۔

۴- مزار کے احاطے میں داخل ہو کر بائیں طرف ایک بڑا قبرستان تھا جہاں نئی اور پرانی قبریں بنی ہوئی تھیں، جس میں لوگ تبرکا یا عام عادت کی وجہ سے اپنے مردوں کو دفناتے تھے۔

۵- مزار کے احاطے میں ہی وضو خانہ استنجا خانہ بنے ہوئے ہیں جہاں پر صفائی کرنے والے حضرات کا تعین بھی ہوا ہے تاکہ وہ اس میں رکھے تولیے وغیرہ کی صفائی کریں۔(ایک چیز کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں صفائی پر مامور حضرات کے بارے میں یہ خیال دل میں پیدا نہیں ہوتا تھا کہ یہ کسی چھوٹی ذات کے لوگ ہیں، یا یہ ہم سے حقیر ہیں، عقیدۃ اور نظریہ کے لحاظ سے یہ سوچ تو ہماری پاکستان میں بھی نہیں ہے، لیکن عملاً اگر دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ صفائی کرنے والا ہمارے ہاں بھی ہندوؤں کی طرح پنچ ذات کا شمار ہوتا ہے، چاہے وہ عیسائی ہو یا وہ کسی اور مذہب کا ہو، لیکن صفائی والے کو مسجد کے اندر مسلمان ہونے کے باوجود حقیر سمجھتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائی منشری نے ان پر کام کرکے عیسائی بنا ڈالا اور ہم مسلمان اب بھی انہیں اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے بقول گویا یہ صفائی کرنے والے حضرات ہمارے رویہ کی وجہ سے عیسائی بنے، ورنہ ان مشرقی ممالک میں عیسائیت نہیں ہوا کرتی تھی، یہ سب ہندو تھے، جنہیں ہمارے غلط رویے نے عیسائی بنا دیا، اگر ان کے ساتھ ہمارا رویہ ٹھیک ہوتا تو شاید یہ عیسائی کے بجائے مسلمان ہوتے، لیکن یہ سب کچھ ہم نے ازبکستان میں نہیں دیکھا، وہاں صفائی والے کو بھی حقیر نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، ان کے کپڑے صاف ستھرے ان کے لباس سے یہ بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ صفائی کرنے والے ہیں۔)

مرقد امام ترمذی رحمہ اللہ

امام ترمذی رحمہ اللہ کا مرقد ایک عمارت میں بنے تین ہالوں میں سے ایک ہال میں ہے، جس میں صرف انہی کا مرقد ہے، سنگ مرمر سے بنی قبر، جس پر امام ترمذی رحمہ اللہ کا نام کندہ ہے، ایک جلیل القدر، ماہر فن حدیث، نقل مذاہب کے بہت بڑے مأخذ، دوطرفہ روایتیں جمع کرنے والے معتمد و ثقہ امام، امام ابو عیسی ترمذی رحمہ اللہ کے جلالت شان پر لکھا ہوا کتبہ تو دلیل نہ بن سکا، لیکن ان کے قبر کا رعب، پھر امام ترمذی رحمہ اللہ کی قدر و منزلت نے پورے مجمع پر گریہ طاری کر دیا تھا، کسی کی آنکھیں مکمل ڈبڈبائی تھیں، کسی کے ہونٹ بھی شدت غم کی وجہ سے ہل رہے تھے، کوئی اس جلیل القدر امام کی عظمت کو سوچ کر اپنے رونے کی آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا، کسی کے آنسو اس کے آنکھوں کے آگے جالا تانے ہوئے تھے، کسی کا دل کی کیفیت کو

ضبط کر کے اندر دبانے کی وجہ سے پورا جسم ہل رہا تھا، ایک عجب سماں تھا، کوئی مرقد امام المحدثین پر پہنچنے کے شکریہ میں رو رہا تھا، کوئی بعد زمان کی وجہ سے حدیث کا شوق پورا نہ کر سکنے کی وجہ سے نالہ و فریاد کناں تھا، کسی کی نظریں قبر کے ارد گرد یوں گھوم رہیں تھیں، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی زیارت نصیب ہوئی ہو اور وہ انہیں ہر جہت سے دیکھنا چاہتے ہیں، کسی کی نظریں فرط حیا سے جھکی ہوئی تھیں، کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے جلیل القدر محدث کے ہاں حاضری ہوئی ہے، کوئی اس خوبصورت گھڑی اور لمحے کو اپنی یادداشت اور دوسرے دوست احباب، گھر والوں کے لئے کیمرہ کی آنکھ میں قید کرنے میں مصروف تھا، کوئی در و دیوار سے امام ترمذی رحمہ اللہ کی خوشبوئیں سونگھنے میں مصروف تھا، کسی کی نگاہیں ایک طرف، کسی کا دیہان ان سے جڑی ہوئی دوسری کسی چیزوں کی طرف تھا، غرض ہر شخص ہی کچھ لمحہ کے لیے گویا ''حضرت الامام'' اور ان کی زندگی میں مگن و مصروف ہو گیا، اس ظاہری دنیا سے چند لمحہ کے لیے عالم دیگر میں جا کر امام کے تصور میں مگن ہو گیا، کسی کا ادراک زیادہ قوی تھا، تو کوئی مجھ جیسا باطن سے کورا بھی تھا، جنہیں ظاہر سے جو ملا سو ملا باطن کی خیر، اس پر حضرت الاستاذ مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم کے ہلتے جسم، بہتے آنسوؤں، لرزتے ہونٹوں، گریہ میں مانگی جانے والی امام ترمذی رحمہ اللہ کے لیے دعاؤں نے ایک عجیب سی فضا پیدا کر دی تھی، استاد محترم گویا دل ہی دل میں حضرت الامام سے سرگوشیاں کر رہے تھے، کسی احسان پر شکریہ ادا کر رہے تھے، کسی کام کی کارگزاری سنا رہے، دیکھنے والا دیکھ کر اس وقت یہی سوچ سکتا تھا کہ ایک علم حدیث سے تعلق رکھنے والا محدث دوسرے جلیل القدر محدث کے پاس پہنچ کر اپنے کاموں کی کارگزاری یا پھر ان کے کیے ہوئے کاموں کی شکر گزاری میں گویا مصروف ہے۔

کافی دیر تک استاد محترم کو اسی حال میں دیکھا، بس روتے جا رہے تھے، حال دل کہتے جا رہے تھے اور امام ترمذی رحمہ اللہ کے شکریہ کے طور پر ان کو دعائیں دیتے جا رہے، آنسو کی بارش، لبوں کے لرزے نے مجمع پر ایک گریہ طاری کر رکھا تھا، کئی وہ لوگ جو استاد محترم کی طرف متوجہ تھے، استاد جی کے رونے سے ان کی گریہ وزاری میں فرق آیا اور وہ پہلے سے زیادہ رونے لگے، ادھر مولانا حسن صاحب اپنی عاجزانہ ادا کے ساتھ ایک طرف ہو کر نظریں جھکائے، گویا امام ترمذی رحمہ اللہ سے محو گفتگو تھے، اور دعاؤں میں مصروف تھے، ایک طرف مولانا ارشد الحسینی صاحب کھڑے تھے تو دوسری طرف مولانا عزیز الرحمن رحمانی صاحب، ہر شخص کا

معاملہ الگ اور عجب تھا۔

فاتحہ خوانی سے فارغ ہو کر اسی جگہ بنے دوسرے ہال میں بنچوں پر سب بیٹھ گئے اور استاد محترم کے درس کے لیے ہم سب تیار ہو گئے، اولا استاد محترم نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے بارے میں کچھ مختصر باتیں بتائیں، جن میں امام ترمذی رحمہ اللہ کی کچھ خصوصیات بھی ذکر کیں، خصوصا نقل مذاہب اور فقہاء کرام کے لیے فراہم کردہ مواد اور اپنی کتاب کو اسی طرز پر مرتب کرنا اور ترتیب دینے سے یہی غرض رکھنا جو کہ احادیث مبارکہ میں اصل ہے، فقہاء کرام کے قول کو ترجیح دینا، یہ ساری چیزیں ذکر فرما کر ترمذی شریف کی اجازت بھی مرحمت فرمائی، حاضرین مجلس میں جو علماء تھے ان سب کو اجازت بھی دی اور دعا پر اس مجلس کا اختتام ہوا، اس کے بعد حاضرین جو ہدایا وغیرہ کتابی شکل میں یا تحریرات کی شکل میں لائے تھے، وہ وہاں موجود علماء اور حکومتی نمائندوں میں تقسیم کیے، خصوصا مولانا عزیز الرحمن رحمانی صاحب، مولانا طلحہ رحمانی صاحب، مفتی رضوان عزیز صاحب وغیرہ، اس دوران مفتی احمد انور صاحب عمامہ بھی باندھ کر وہاں کے معززین کے اعزاز کو بڑھاتے رہے، اور مولانا سلمان انبالوی صاحب مستقل تصویر سازی میں مصروف رہے، جس میں سے غیر جاندار کی تصویریں واقعی مطلوب بھی تھیں، کہ اس طرح کے مقامات کو قید تحریر کے ساتھ قید تصویر میں بھی ہونا چاہئے تھا۔

ان سب معاملات سے فارغ ہو کر ساتھی وہیں پر موجود مکتبہ کے دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے، استاد محترم اس ہال سے باہر تشریف لے گئے، بندہ، مولانا یاسر عبد اللہ صاحب، مفتی عمران ممتاز صاحب کی چاہت تھی کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے مزار پر سنن الترمذی کی کچھ قراءت کر لی جائے، زندگی میں تو ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کر سکے، کم از کم ابھی ان کی قبر کے سامنے آ کر تو انہیں کچھ سنا کر کلیجے کو ٹھنڈک پہنچا دیں، چنانچہ ہم مزار کی طرف آتے ہوئے ہی طے کر چکے تھے کہ تھوڑی قراءت کرنی ہے، جب استاد محترم باہر نکلے تو مولانا ثناء اللہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ استاد محترم کے ساتھ رہیں، تاکہ بندہ اندر قبر کے پاس جا کر دلی خواہش پوری کر سکے، اندر جب تینوں حاضر ہوئے باقی سب ساتھی مکتبہ کی طرف جا چکے تھے، ابھی ہم نے کچھ قراءت کی تھی کہ مفتی حسن صاحب بھی تشریف لے آئے اور بیٹھ کر پوچھا کہ ترمذی ہے، ہم ساتھیوں نے کچھ قراءت کر لی تھی، ترمذی شریف حضرت کے حوالہ کی انہوں نے بھی ترمذی شریف کی ایک حدیث پڑھی، ایک بار پھر مفتی حسن صاحب کی دعا کے ساتھ امام المحدثین کی قبر کے پاس سے رخصت ہوئے، وہاں بہت ساری چیزیں بتانے کا

دل چاہا، بہت ساری باتیں کرنے کا من کیا، لیکن میں تہی دامن کیا کہتا، روانہ ہوئے بس ایک دعا دل میں تھی کہ اے اللہ جو آپ نے ان حضرات کو نوازا تھا ہمیں بھی اس سے بہرہ ور فرما، نہ جانے دوبارہ حاضری ہو یا نہ ہو، لیکن ان کے پاس سے جانا ہی تھا، وہاں سے اٹھ کر دوبارہ اپنے قافلے کے افراد سے جا ملے جو پہلے ہی بس کے پاس موجود تھے۔

یہ ''شہر بود''کا علاقہ تھا، یہاں سے ہم سمرقند کے لیے روانہ ہوئے، امام ترمذی رحمہ اللہ کے مزار کے بعد پہاڑوں کے درمیان، اوپر چلتے رہے، ایک جگہ چیک پوسٹ تھی، جہاں ہر مسافر کی چیکنگ ضرور ہوتی تھی، اور پاسپورٹ بھی چیک کیا جاتا تھا، چاہے وہ ملکی ہو یا غیر ملکی ہو، جب بس وہاں رکی شاید یہ وہاں کی ولایت کے اختتام کے موقع پر ہوتا تھا، ہم سب بس میں بیٹھے رہے ہماری تلاشی بھی نہیں لی گئی اور پاسپورٹ بھی چیک نہیں کیے گئے، بلکہ صرف پروٹوکول کی گاڑی تبدیل ہوئی اور پولیس کی گاڑی بدلی، کیونکہ اب دوسرا علاقہ شروع ہو رہا تھا، اب اس علاقہ میں ہمارے پاس اس نئی ولایت کے مفتی اعظم اور نئی پولیس موبائل آئی جو ہمارے ساتھ آگے جاتی رہی، یہاں ہمارے ساتھ تقریبا تین گاڑیاں تھیں، ایک ان کے خطیب رجب علی صاحب کی دوسری دو گاڑیاں یہاں کے مقامی لوگوں کی، یہاں چیک پوسٹ کے پاس جب گاڑی کھڑی تھی، تو ایک نوجوان بس میں چڑھے، جس کے بارے میں مفتی رضوان صاحب نے بتایا کہ یہ یہاں اسکول ٹیچر ہیں اور آپ لوگوں سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے ازبکی زبان میں کہا (جس کا ترجمہ بھائی سنجار صاحب نے کیا) کہ آپ لوگوں کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں، ہم کافی عرصہ سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہے تھے''، یہ کہہ کر اور شکریہ ادا کر کے وہ بس سے نیچے اتر گیا، پھر بعد میں جب گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ وہ اس ولایت میں ہمارے ساتھ رہیں گے، ولایت کے مفتی اعظم نے بھی سب کا شکریہ ادا کیا اور سب کو خوش آمدید کہا۔

گاڑی روانہ ہوئی تو راستے میں ''دہقان آباد''نامی ایک جگہ آئی جہاں ہم نے پہلی بار کسی کو عام لباس میں ملبوس دیکھا، بس ایک مسجد کے قریب رکی، جو سڑک سے کافی نیچے تھی، استاد محترم کے اترنے کے بعد ہم مسجد کی طرف نیچے اتر گئے، سردی بہر حال پڑ رہی تھی، استاد محترم نے چادر اوڑھ رکھی تھی، باقی ساتھی بھی سردی کے لباس میں ملبوس تھے، مسجد کے پاس استنجے خانے بنے ہوئے تھے، ایک چھوٹا کمرہ تھا، جس میں دو افراد بیٹھے

تھے، اور ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ رکھا تھا، جب انہوں نے داڑھی ٹوپی والے حضرات کو دیکھا تو جلدی باہر نکل آئے اور گروپ کے حضرات کے ساتھ بات چیت شروع کر دی، یہاں جو خوش کن چیز دیکھنے میں آئی وہ ان کی داڑھی تھی جو اب تک ہمیں خال خال ہی نظر آئی تھی، یہ شخص یہاں کے نائب امام تھے، جو عمر رسیدہ تھے اور وہاں کے سردی کا مخصوص لباس جو کمبل کی طرح لگتا تھا اوڑھے ہوئے تھے، اتنے علماء کو یکجا دیکھ کر بہت خوش ہوئے، کافی دیر بات چیت چلتی رہی اس دوران ساتھی اپنی ضروریات سے بھی فارغ ہو کر آتے رہے، اور آکر ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے رہے، جس کا ترجمہ بھائی سنجار کر لیتے تھے، جب ہم یہاں سے جانے لگے تو ایک شخص نے اپنی پگڑی اتار کر مفتی حسن صاحب کو پہنائی، طویل عمامہ جو یہاں پر نقشبندی حضرات پہنا کرتے تھے، مخصوص ٹوپی جو عمامے کے نیچے باندھتے تھے وہ مفتی حسن صاحب کے سر پر رکھ کر عمامہ باندھا جو واقعی ان پر بچ بھی رہا تھا۔

یہاں ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس علاقے کا نام دہقان آباد (کسان آباد) تھا، محلے کی اس مسجد کے امام کے بارے میں جب معلوم کیا تو وہ بھی دہقان تھے اور اس وقت کسی کھیت میں کام کرنے گئے تھے، لوگوں نے بتایا کہ امام صاحب کھیتی باڑی کر کے آئیں گے اور نماز کے بعد دوبارہ چلے جائیں گے۔

یہ ایک دیہاتی علاقہ تھا، جہاں لوگوں کا لباس شہری لباس کے برعکس اپنی اصلی حالت میں معلوم ہو رہا تھا، کیونکہ یہاں عورتوں نے پینٹ شرٹ نہیں پہنے تھے، بلکہ عام لباس تھا، نائب امام کا لباس بھی پینٹ شرٹ کے بجائے عام لباس تھا، یہ تو یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ روسی تسلط کے زمانے میں لباس وغیرہ سے یہ علاقے بھی متاثر ہوئے تھے یا نہیں؟، البتہ دیگر لوگوں کی بنسبت شاید کم ہی متاثر ہوئے ہوں گے، غرض یہ پہلی جگہ تھی جہاں پر داڑھی ٹوپی والے ہمیں زیادہ نظر آئے، اگرچہ تاشقند میں معہد الامام البخاری کے بعض طلبہ بھی داڑھی والے نظر آئے تھے، لیکن ان کا لباس پینٹ شرٹ ہی تھا، اس جگہ (دہقان آباد میں) نائب امام کا لباس پینٹ شرٹ نہیں تھا اور چند دیگر افراد بھی عام معمول کے برعکس نظر آئے تھے، یہاں داڑھی پر پابندی تو نہیں، لیکن روسی اثرات کی وجہ سے داڑھیاں رکھنے والے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔

روسی استعمار نے ان کے لباس و پوشاک پر بہت اثر کیا ہے اور ہر تہذیب کے پھیلانے میں لباس کا بہت بڑا اثر ہے، اس لیے کہ آدمی جس سے متاثر ہوتا ہے اسی کے لباس کو اختیار کرتا ہے، جو شخص یورپی ثقافت سے

متاثر ہو گا اور اس کے پاس احساس کمتری ایک وافر مقدار میں ہو گی تو وہ شخص لازماً انہیں کے لباس کو پسند کرے گا، ورنہ کبھی ان کے لباس کو اختیار نہ کرے، لباس کے اختیار کا تعلق جواز وعدم جواز سے نہیں، بلکہ تاثر وعدم تاثر سے ہے، جو شخص کسی کے لباس کو اختیار کرتا ہے وہ رفتہ رفتہ انہیں کے خدوخال کو اپنانے میں مگن ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود کو اپنی تہذیب کو بھول جاتا ہے، بقول استاد محترم: ”علماء دیوبند نے برصغیر میں مشرقی تہذیب کو محفوظ کیا ہے، ورنہ ان کا لباس وپوشاک سب تبدیل ہو چکا ہوتا“۔

دہقان آباد میں داڑھی ٹوپی والے حضرات کو دیکھ کر قریب کے کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور کافی دیر تک ساتھ کھڑے رہے، ہر ایک فرد یہاں دعا کا بہت زیادہ خواہاں ہے، علماء کو دیکھ کر دعا کی درخواست ضرور کرتے ہیں، ہر جگہ کی طرح یہاں بھی لوگوں کے ہجوم میں محبت وخلوص کا وافر حصہ نظر آیا اس سے ان کے جدی پشتی علم دوستی ومحبت کا خوب اندازہ ہوتا ہے، مجمع کے ساتھ کافی دیر تک کھڑے رہے جب بس روانہ ہوئی تو محبت وعقیدت کے ساتھ رخصت کر کے چل دیئے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کے مزار کے بعد سے اب تک پہاڑی سلسلہ ہے، لیکن پہاڑ خشک ہیں، ان پر سبزہ یا جنگلات نظر نہیں آئے، البتہ درمیان میں کہیں کہیں پر آبادیاں ہیں، جن میں کھیت بھی ہیں اور کھیتی باڑی کرنے والے بھی ہیں، مختلف لوگ اس میں پاکستان کی طرح کھیتی باڑی میں مصروف ہیں، بس ایک اچھی چیز ہے کہ پاکستان کے کھیتوں میں جس طرح ٹریکٹر میں گانوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے وہ یہاں نہیں دیکھا، ہر شخص اپنے کام میں مگن ہے، دوسروں کو تکلیف کی ظاہری صورتیں یہاں ہمیں نظر نہیں آئیں، اندر اور گھروں کے حال سے بہر حال ہم واقف نہیں تھے۔

گاڑی یہاں سے روانہ ہو کر ”شہر کتاب“ پہنچی جو صوبہ قشقہ دریا کا ایک ضلع ہے، اور وہاں ہم نے مرزا الغ بیگ [1] کے مزار پر حاضری دی جو فلکیات کے بڑے ماہر تھے اور امیر تیمور کے علم دوست پوتے تھے، ان کی

---

(۱) مرزا الغ بیگ ۲۲ مارچ ۱۳۹۴ء کو سلطانیہ، ایران میں پیدا ہوئے۔ علم نجوم کے بہت شوقین تھے، امیر تیمور کے علم دوست پوتے تھے جنہوں نے سمرقند میں ایک عظیم الشان رصد گاہ تعمیر کی، نجوم کے جو نقشے انہوں نے تیار کیے وہ نہایت درست تھے۔ ۱۶۵۰ء میں یہ نقشے لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئے اور آکسفورڈ سے شائع کیے گئے، ایران کا موجودہ کیلنڈر بھی اُنہی کا مرتب کردہ ہے اور بروج کے نام اور ان کے مقام بھی اُنہی کے دیے ہوئے ہیں، ان کے عہد میں سمرقند کا شمار دنیا کے حسین ترین شہروں میں ہوتا تھا۔

سلطان مرزا الغ بیگ کو اُن کے باغی بیٹے عبداللطیف مرزا نے ۲۷ اکتوبر ۱۴۴۹ء کو سمرقند کے مضافات میں قتل کروا دیا تھا۔

اور ان کے خاندان کے کچھ لوگوں کی قبریں اس احاطے میں بنی ہوئی تھیں، یہ احاطہ بھی کافی بڑا تھا، جس میں مختلف شاہی خاندان کے لوگوں کی قبریں تھیں، اس احاطے میں داخل ہو کر کچھ فاصلہ پر دائیں طرف وضو خانہ وغیرہ بنا ہوا تھا، جو انتہائی صفائی ستھرائی کا حامل تھا، درمیان میں کئی جگہ باغیچے بنے ہوئے تھے، ان باغیچوں سے گزر کر چند سیڑھیاں تھیں، جن پر اوپر چڑھ کر ان قبروں کے پاس جانا تھا، رستے میں دیوار میں سوراخ کر کے یا کسی لکڑی میں کیلوں کے ذریعے ٹانگے ہوئے ثقافتی لباس، تھیلیاں اور طرح طرح کی چیزیں تھیں، جو بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں بیچ رہی تھیں، ہر فرد سلام کا اتنا پابند تھا جیسے روسی اثرات کو دور کرنے کے لیے ان کے ذمہ سرکاری طور پر سلام کو لازم کر دیا گیا ہو، کئی جگہ پر بوڑھی خواتین نے سلام کیا اور بہت مشفقانہ انداز میں ملک کا پوچھا، جب جواب میں پاکستان کا لفظ سنتیں، تو خوشی سے جھوم جاتیں گویا پاکستان کا نام نہیں سنا، بلکہ اپنی توقع اور بات کی تصدیق کے لیے سر ہلا رہی ہوں، ساتھ میں دعا کی درخواست بھی کر جاتی تھیں، خصوصا استاد محترم کا وجود ہمارے درمیان ویسے بھی باعث برکت تھا، لیکن ان حضرات کے لیے استاد محترم کا جانا ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، بار بار مردوزن رکتے اور دعا کی درخواست کرتے، استاد محترم ان کی علم اور دین سے محبت پر آنکھوں سے تصدیق کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں بار بار ایک فیاض شخص کی طرح ہاتھ اٹھا کر یا لب ہلا کر دعا دیتے اور ساتھ میں نہ جانے کس مراقبہ کے ساتھ روتے رہتے اور آگے چل دیتے، کبھی کبھار یہ فرما بھی دیا کرتے تھے کہ ”میاں ان کی بہت محبت ہے اللہ ان کی محبتوں کا صلہ دیں“۔

ظہر کی نماز اسی احاطے میں بنی مسجد میں پڑھی، اس کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر کھانا کھایا، کھانے کے بعد خواجہ محمد درویش رحمہ اللہ کے مزار پر رکے، جو ایک درختوں کی جھرمٹ میں بنی بستی میں موجود ہے، اسی کے ساتھ ایک مسجد بھی ہے جس میں باوضو ساتھیوں نے نماز پڑھی، جنہیں وضو کرنا تھا انہیں ایک آزمائش سے گزرنا تھا، کیونکہ یہاں پر ماحول دیہاتی، سردی زیادہ اور وضو خانے بھی ایسے تھے کہ ان میں گیزر چل نہیں رہے تھے، استاد محترم نے ٹھنڈے پانی سے وضو بنایا، لیکن مجال ہے کہ رخصت پر عمل کرنے کا سوچا بھی ہو، رخصتوں پر عمل ہم جیسے رخصت تلاش لوگوں کا کام ہے، استاد محترم نے اور دیگر افراد نے ٹھنڈے پانی سے وضو فرما کر ایک درخت کی شاخ کے نیچے سے گزر کر، چھوٹے سے رستے پر سے ہوتے ہوئے، کھیتوں کے بیچوں بیچ بنے رستے، کھیتوں کو سیراب کرتی پانی کی چھوٹی چھوٹی نالیوں پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے اور خواجہ محمد درویش

صاحب رحمہ اللہ کے مزار کے پاس بنی مسجد میں نماز پڑھنے کے بعد حضرت خواجہ صاحب کے مزار پر حاضری دی۔

خواجہ محمد درویش:

خواجہ درویش محمد رحمہ اللہ سلسلہ نقشبندیہ کے اکابر صوفیاء میں سے تھے، ان کے بچپن کے حالات پردہ خفا میں ہیں، صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ آپ ۱۶ شوال ۸۴۶ ھ بمطابق ۶ فروری ۱۴۴۴ ء کو اسقرار میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ نہایت بزرگ خاتون اور ولی کامل عارف باللہ محمد زاہد کی بہن تھیں۔ اسی نسبت سے آپ کی تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔

آپ خواجہ محمد املنگی رحمہ اللہ کے شیخ تھے اور سلسلہ نقشبندیہ میں لوگوں نے آپ سے بہت استفادہ کیا، آپ کا وصال بروز جمعرات ۱۹ محرم الحرام ۹۷۰ ھ بمطابق ۱۵۶۲ء کو ہوا۔ آپ کا مزار اقدس آپ کے آبائی گاؤں اسقرار (ماوراء النہر) میں ہے۔ (وکی پیڈیا)۔

ازبکستان کے مزار

ازبک قوم کے پاس سیاحت کے لیے سب سے بڑی چیز یہی تاریخی مقامات ہیں، یہی مزار، یہی محلات و مرغزار ان کا قومی ورثہ ہے، جس کی وجہ سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہاں مزاروں کو کمانے کا ایسا ذریعہ نہیں بنایا جو خرافات کا منبع، بدعات کی فیکٹریاں ہوں، بلکہ یہاں کے مزاروں کا حال کچھ یوں ہے:

ہر مشہور شخص کی قبر کے ارد گرد دیوار لگا دی گئی ہے تاکہ کوئی قبر کے پاس جاکر مٹی کو نہ چھیڑ سکے ہر مزار میں قبر کے پائنتی اور دائیں بائیں بنچیں لگا دی گئی ہیں تاکہ آنے والا وہیں سے دعا کر کے واپس پلٹ جائے، وہیں پر بیٹھ کر وہاں کے لوگ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اور دعا کر کے چلے جاتے ہیں، نہ شور شرابہ، نہ کوئی بے ہودگی، نہ ہی کوئی سجدہ تعظیمی وغیرہ، نہیں کوئی ڈھول دھمال نہ کوئی اور وبال، بلکہ بعض عوام و خواص

میں مشہور لوگوں کی قبروں کے پاس دیوار کے ساتھ ساتھ ایک ڈوری بھی لگادی گئی تاکہ کوئی قبر کے پاس بنی دیوار کو بھی نہ چھوئے، بہت زیادہ مشہور اکابر کی قبروں کا وہی طریقہ کار اختیار کیا ہے، جو ہمارے ہاں قائد اعظم محمد علی جناح کے مزار میں اختیار کیا گیا ہے، یعنی قبر کا ایک نشان اوپر کی طرف آویزاں کیا گیا ہے جس کے پاس کھڑے ہو کر لوگ دعا کرتے ہیں، اور اصل اسی کے بالمقابل نیچے کی طرف قبر ہوتی ہے، بعض قبروں کو انہوں نے کمرے میں بند کر رکھا تھا اور اس کے دیوار میں جالی بنا رکھی تھی تاکہ لوگ اگر قبر دیکھنا چاہیں تو وہی سے دیکھیں اور دعا کر کے چلے جائیں، صرف خواص کو وہاں جانے کی اجازت ہوا کرتی تھی، جو مزار عوام میں زیادہ مشہور نہیں، بلکہ اہل تصوف کے ہاں ہے یا پھر علماء کے ہاں مشہور ہیں تو ان کی قبروں کو بند کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی، کیونکہ وہاں خرافات کا نہ ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔

خواجہ محمد درویش رحمہ اللہ کا مزار

اسی طرح کی قبر خواجہ محمد درویش رحمہ اللہ کی بھی تھی جو دیوار کے ذریعے بند تو کردی گئی تھی، اس کے گرد اونچی دیوار لگائی گئی تھی، لیکن عام قبرستان میں بنی یہ قبر دیگر رکاوٹوں میں گھری ہوئی نہیں تھی، قبر کے احاطے میں جھانکنے کے لیے وہاں بنی اونچی ٹیلے نما جگہ پر چڑھ کو کچھ قبر کا حصہ نظر آتا تھا، مکمل قبر کا پتہ نہیں چلتا تھا، یہاں بھی قاری عبد الرحمن رحیمی صاحب نے تلاوت فرمائی اور دعا ہوئی، اسی قبرستان میں دیگر بعض بزرگ بھی مدفون تھے، جن میں سے خواجہ شمس الدین کلال رحمہ اللہ بھی تھے۔

خواجہ شمس الدین کلال

خواجہ شمس الدین کلال خواجہ سید امیر کلال رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے تھے، حجاز مقدس کا سفر کیا، عراق میں مشائخ وقت کی صحبت حاصل کی اور ان کے مراقبہ کا طریقہ ماوراء النہر میں رائج کیا، ابتداء خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمہ اللہ سے تعلق نہ تھا، بعد میں خواجہ صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔(مفتی رضوان عزیز صاحب)۔

یہاں کے قبرستان کے کتبے دیکھ کر ایک چیز عجیب لگی کہ اکثر قبریں بوڑھے لوگوں کی تھیں، جن کی تاریخ پیدائش ۱۹۲۰، ۱۹۲۸، ۱۹۲۷ کی تھی، جس سے ایک بات تو یہ معلوم ہو رہی تھی کہ قبریں بوڑھوں کی ہیں اور تاریخ وفات بھی بعد کے زمانے کی تھی، کسی کی عمر اسی سال، کسی کی پچھتر سال، کسی کی نوے، غرض سب ہی بوڑھے بوڑھے معلوم ہوتے تھے، یا تو جوانوں میں اموات کم ہوتی تھیں یا جوان اپنے علاقوں میں رہنے کے بجائے کہیں اور جا کر آباد ہوتے اور بڑھاپے میں اپنی مٹی کی یاد ستاتی تو اپنے ملک چلے آتے تھے، بہر حال قبریں اکثر بوڑھوں کی نظر آئیں جو خواجہ صاحب کی قبر کے قریب قریب تھیں۔

خواجہ محمد املنگی

حضرت خواجہ محمد مقتدی رحمۃ اللہ علیہ بخارا کے ایک گاؤں امکنہ میں ۹۱۸ھ بمطابق ۱۵۱۲ یا ۱۵۱۳ء کو قطب عالم حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پیدا ہوئے، اسی نسبت کی وجہ سے املنگی کہلاتے ہیں۔

آپ کے والد ماجد اپنے زمانے کے اولیائے کاملین میں سے تھے، آپ کی یہ خوش نصیبی و خوش بختی تھی کہ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ خالص دینی اور تقوی کا ماحول تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نہایت بزرگ خاتون تھیں، جب والدین صاحب تقوی ہوں اور مقربین بارگاہ الٰہی بھی ہوں تو اولاد پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، خداوند تعالی نے آپ سے عظیم کام لینا تھا، اس لئے بچپن سے ہی بزرگی کے آثار آپ کے چہرۂ انور پر ظاہر تھے، والدین نے بھی اس چیز کو ملحوظ خاطر رکھا اور آپ کی بہترین تربیت فرمائی، آپ نے اپنے والد بزرگوار کے دست حق پرست پر ہی سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں بیعت فرمائی اور اپنے والد بزرگوار کے قلب منور سے خوب نور کمال و فروغ اکمال کا کسب کیا، آپ کی طبعی استعداد اور ذاتی قابلیت نے اس نسبت کے حسن میں چار چاند لگا دیئے، سیر و سلوک کی تکمیل کے بعد خرقۂ خلافت بھی اپنے والد بزرگوار حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا، لیکن آپ کی طبیعت مبارکہ پر بھی عاجزی و انکساری کا غلبہ رہتا تھا اس لئے آپ نے مخلوق کے اژدہام سے خود کو پوشیدہ رکھا، ایک عرصہ تک لوگوں کو علم نہ ہو سکا کہ حضرت کی روحانی استعداد کیا ہے، لیکن حق سبحانہ و تعالی کو منظور ہوا کہ آپ سے طالبان طریقت کی تربیت کا کام لیا جائے تو آپ اولیائے

عزلت کے گوشہ سے نکل کر اولیائے عشرت کی انجمن میں تشریف لے آئے، اس کے بعد طالبانِ طریقت اور تشنگانِ معرفت کا رجوع آپ کی طرف ہوا، کسی کو خواب کے ذریعہ آپ کی طرف رہنمائی کی گئی، کسی نے دوسروں سے سن سنا کر اور کسی نے آپ کے تربیت یافتہ افراد کو دیکھ کر آپ کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ بہت سے خفتہ دل آپ کی صحبت کی برکت سے خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور بہت سے فاضل آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، منجملہ ان افراد کے آپ کے حلقۂ ارادت میں حضرت مولانا درویش علیہ الرحمۃ بھی تھے جو اپنے زمانے کے مقتدر علماء میں سے تھے اور صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے جو چالیس سال تک علوم نقلیہ و عقلیہ کی اشاعت فرماتے رہے۔

حضرت مخدوم خواجہ املنگی رحمۃ اللہ علیہ تیس برس تک اپنے والد ماجد کے مسند مشیخیت پر جلوہ افروز رہے۔

آپ خواجہ خواجگان بہاؤالدین نقشبند قدس سرہ کے اصل طریقہ نقشبندیہ کی بڑی سختی سے پابندی فرماتے تھے، اس طریقہ میں جو نئی باتیں پیدا ہوگئی تھیں، مثلاً ذکر بالجہر، اذان و جماعت تہجد وغیرہ ان سے پرہیز فرماتے۔ آپ کی طبیعت مبارکہ میں انتہا درجہ کی انکساری تھی، آپ پر دیدۂ قصور کا غلبہ رہتا تھا، ایک دن کسی نے عرض کیا کہ حضرت مسجد کا راستہ بلندی پر ہے اور حضرت کو بڑھاپے کے باعث کمزوری لاحق رہتی ہے، اگر عصر، مغرب و عشاء کی نمازیں مسجد میں ادا کر کے ایک ہی بار واپس جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو، کیونکہ تین بار آنا جانا ضعیفی میں خاصہ مشکل ہے، آپ نے ارشاد فرمایا "جیسی نمازیں ہم پڑھتے ہیں اس میں بس مسجد میں آنا جانا ہی تو کام ہے، باقی ہماری نمازوں میں کیا رکھا ہے"، تمام مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کی خاطر تواضع اور شگفتگی آپ کے بوستان کردار کا حصہ تھا، اگر کوئی مہمان آپ کے گھر آجاتا تو بڑھاپے کے باوجود کہ آپ کے مبارک ہاتھوں میں لرزہ تھا، آپ خود بنفس نفیس اس کی خدمت میں مصروف ہو جاتے، اس کے لئے خود دستر خوان بچھاتے، بسا اوقات مہمان کی سواری اور خادم تک کی خود خبر گیری فرماتے۔ عبداللہ خان والئ نوران نے خواب میں دیکھا کہ ایک عظیم الشان خیمہ لگا ہے جس میں حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رونق افروز ہیں، ایک بزرگ بارگاہ اقدس کے دروازے پر ہاتھ میں عصاء لئے تشریف فرما ہیں اور لوگوں کی معروضات حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بارگاہ میں پیش کر کے جواب لا رہے ہیں، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بزرگ کے

ہاتھ ایک تلوار مجھے ارسال فرمائی اور انہوں نے آکر میری کمر میں باندھ دی، اس کے بعد عبد اللہ خاں کی آنکھ کھل گئی، اس نے بزرگ کے حلیہ مبارک کو ذہن میں محفوظ رکھا اور بزرگ کی تلاش و جستجو میں مصروف رہا، حتی الوسع اپنے مقربوں اور درباریوں سے اس بزرگ کا سراپا بیان کرکے ان کے متعلق دریافت کرتا رہا، کافی عرصہ کے بعد اس کا ایک مصاحب حضرت خواجہ املنگی علیہ الرحمۃ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو اس نے آپ کو بادشاہ کے بتائے ہوئے حلیہ کے مطابق پایا، وہ فوراوہاں سے عبد اللہ خاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس حلیہ کے بزرگ جن کو آپ نے بیان فرمایا حضرت مولانا خواجہ املنگی ہیں۔ بادشاہ بڑا خوش ہوا اور بڑے شوق سے ہدایا وتحائف لے کر حاضر خدمت ہوا، آپ کو بعینہ وہی پایا جو خواب میں دیکھا تھا، بادشاہ نے نہایت تواضع وانکساری کا اظہار فرمایا اور نذرانہ قبول کرنے کیلئے التماس کی، مگر آپ نے قبول نہ فرمایا، بلکہ ارشاد فرمایا فقر کی حلاوت وشیرینی، نامرادی وقناعت میں ہے، بادشاہ نے آیۃ شریفہ:

﴿یاَأَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا أَطِیْعُوْا اللهَ وَأَطِیْعُوْا الرَّسُوْل وَأُوْلِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ...الآیۃ،[النساء: ٥٩].

(ترجمہ: اے ایمان والو حکم مانو اللہ اور اس کے رسول کا اور ان کا جو تم میں اختیار والے ہیں) پیش کی، تب آپ نے مجبورا قبول فرمالیا، بادشاہ وقت ہر روز صبح کے وقت نہایت عاجزی وانکساری کے ساتھ آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ آپ عزیمت کے بڑے پابند تھے اور آپ کی کوئی خانقاہ نہ تھی، آپ کو انتہادرجہ کی تمکین حاصل تھی، آپ کی مجلس میں رقص وسماع کی گنجائش نہ تھی، ایک مرتبہ بعض مخلصین نے درخواست کی کہ کیا حرج ہے اگر آپ کی مبارک مجلس میں مثنوی مولانا روم پڑھی جائے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ مشکوۃ شریف کی چند حدیثیں پڑھی جایا کریں، بلاشبہ احادیث کا پڑھا جانا زیادہ بہتر ہے۔ ایک دفعہ تین طالب علم مختلف ارادوں سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ایک نے نیت کی اگر حضرت فلاں قسم کا کھانا کھائیں تو بیشک صاحب کرامت ہیں، دوسرے نے دل میں سوچا کہ اگر فلاں قسم کا میوہ عنایت فرمائیں تو ولیٔ کامل ہیں، تیسرے نے خیال کیا کہ اگر فلاں لڑکے کو مجلس میں حاضر کردیں تو صاحب خوارق ہیں، حضرت اقدس نے پہلے دونوں کو تو ان کے خیال کے مطابق عطا فرمادیا، مگر تیسرے کو فرمایا کہ درویشوں نے جو کمالات حاصل کئے ہیں، وہ صاحب شریعت علیہ السلام کی اتباع سے حاصل کئے ہیں، لہذا درویشوں سے کوئی کام خلاف شریعت صادر نہیں

ہو سکتا، اس کے بعد تینوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ امر مباح کی نیت سے بھی درویشوں کے پاس نہیں آنا چاہیئے کیوں کہ بسا اوقات وہ ایسے کاموں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور آنے والے بد اعتقاد ہو کر ان کی صحبت کی برکات سے محروم رہ جاتے ہیں، فقراء کے ہاں کرامتوں کا کوئی اعتبار نہیں، ان کے پاس خالصۃ لوجہ اللہ آنا چاہیئے تاکہ فیض باطنی کا کچھ حصہ مل سکے۔ عبد اللہ خاں کی طرف سے ہرات کے حاکم سلطان کے چچا نے جب ترا کمہ کے ہاتھوں شہادت پائی تو اس کا بھائی باقی خان اپنے والد اور تمام بھتیجوں کو لے کر ماوراء النہر کی طرف چلا گیا، پیر محمد خان نے سمرقند کی حکومت ان لوگوں کے سپرد کر دی، لیکن کچھ دن بعد پیر محمد خان کے دل میں ان لوگوں کی طرف سے بدگمانی اور ایک گونہ خوف پیدا ہو گیا، چنانچہ اس نے پچاس ہزار سواروں کے ساتھ سمرقند پر چڑھائی کر دی، حاکم سمرقند باقی محمد خاں اور اس کے بھتیجوں نے حضرت مولانا امکنگی علیہ الرحمۃ کو بیچ میں ڈال کر رحم کی درخواست کی، اس پر آپ نے پیر محمد خاں کے پاس تشریف لے جا کر اسے نصیحت کی، مگر وہ کسی صورت بھی صلح و آشتی پر رضامند نہ ہوا، اس پر آپ خفا ہو کر واپس آگئے اور باقی محمد خاں سے فرمایا کہ تو دل سے تائب ہو جا کہ آئندہ خلق خدا پر کوئی ظلم و تشدد نہ کرے گا، اس نے آپ سے عہد کیا اور سچی توبہ کی تو آپ نے فرمایا جاؤ جا کر حملہ کرو، ماوراء النہر کی سلطنت تجھے مبارک ہو، یہ فرما کر باقی خان کی پشت پر دست شفقت رکھا اور اپنی تلوار مبارک اس کی کمر پر باندھ کر روانہ کیا، اس کے پیچھے پیچھے آپ بھی درویشوں کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے اور شہر کے کنارے ایک پرانی مسجد میں قبلہ رو ہو کر مراقب ہو بیٹھے، بار بار سر اقدس اٹھا کر پوچھتے تھے کہ کیا خبر ہے، دریں اثنا یہ خبر آئی کہ باقی محمد خاں نے فتح پائی اور پیر محمد خان مارا گیا ہے، اس پر آپ مراقبہ سے اٹھ کر اپنی قیام گاہ پر تشریف لے آئے۔ ایک رات حضرت مخدومی خواجہ کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے، آپ کا ایک ارادتمند ننگے پیر چند خدام کے ہمراہ ساتھ ہی چل رہا تھا کہ اتفاقاً اس کے پاؤں میں کانٹا چبھا، اس کے دل میں خیال آیا کہ کیا اچھا ہو اگر حضرت کی اس سلسلہ میں مجھ پر کچھ عنایت ہو، یہ خیال کیا ہی تھا کہ حضرت مولانا اسی وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے بھائی جب تک پاؤں میں کانٹا نہ چبھے پھول ہاتھ نہیں آتا۔ آپ کی عمر مبارک نوے سال کو پہنچی تو آپ نے اپنے خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ کو خط لکھا، جس میں آپ نے بعد اظہار و اشتیاق دو شعر لکھے جن کا ترجمہ یہ ہے: ”مجھے ہر گھڑی موت یاد آتی ہے نہ جانے کیا پیش آنے والا ہے، مجھے ہر دم وصل خدا رہے، اس کے بعد جو کچھ پیش آنا ہے پیش آئے۔ اس خط

کے پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی آپ کے وصال کی خبر بھی آگئی، آپ کا وصال مبارک ۲۲ شعبان کو ۱۰۰۸ھ بمطابق ۱۶۰۰ع امکنہ میں نوے سال کی عمر میں ہوا، وہیں پر آپ کا مزار مبارک مرجع خاص وعام ہے، برصغیر پاک وہند کی سرزمین آپ کی احسان مند ہے اور تاقیامت آپ کے لئے دعاگو ہے کہ آپ نے اپنے خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ کو یہاں بھیجا تاکہ روحانیت کی پیاسی یہ سرزمین بھی سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے فیوض وبرکات سے مستفید ومستفیض ہو۔ (شجرہ خواجہ محمد امکنگی از مختار احمد کھوکھر)

خواجہ محمد درویش رحمہ اللہ کے مزار سے فارغ ہوکر ہم خواجہ محمد امکنگی رحمہ اللہ کے مزار کی طرف چل دیئے، ان کا مزار کسی اونچے ٹیلے نما جگہ پر بنا ہوا تھا جو آبادی کے بیچ میں تھا، بس کو بھی گلیوں سے ہی گزرنا تھا، چلتے ہوئے لوگوں کی محبت بھری نظریں اور ہاتھ اٹھاکر یا سینے پر ہاتھ رکھ کو بس میں موجود داڑھی والوں کو غور سے دیکھنا اور ان کا استقبال کرنا پورے رستے نظر آیا، بس چھوٹی چھوٹی گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک کشادہ سے چوک پر رکی، جس میں لوگوں کی کثرت تھی، مردوزن چھوٹے بڑے سب ہی بس اور بس کے سواروں کو غور سے دیکھ رہے تھے، کوئی مہمان ہونے کی وجہ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کررہا تھا، کوئی ہمت باندھ کر آگے بڑھ جاتا اور دعا کی درخواست کر بیٹھتا، کچھ طلبہ تھے جنہیں ان علماء کے آنے کا پتہ چلا وہ تو دوڑے چلے آئے اور بزرگوں کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں سے لے لیا، اور خود تبرک کی غرض سے استاد محترم اور دیگر علماء کے ہاتھوں کو پکڑ کر اوپر جانے لگے، جگہ چونکہ اونچی تھی اور دور بھی اس لیے چوک پر گاڑی رکی تو کچھ کاریں مشائخ کے لیے حاضر تھیں، انہیں گاڑیوں میں بٹھاکر اوپر مزار کے دروازے تک پہنچایا گیا، اس کے بعد بھی قبر کافی اونچی تھی، لیکن گاڑی کا رستہ نہیں تھا، اس کے بعد پیدل ہی جانا تھا، خیر سب حضرات اوپر کی طرف چل پڑے کچھ طلبہ استاد محترم کی طرف لپکے اور عاجزانہ درخواست کرکے استاد جی کا ہاتھ پکڑلیا اور اوپر لے جانے لگے۔

جگہ اونچی تھی لیکن الحمدللہ استاد محترم کو اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری نہ تھی، ماشاءاللہ نہ سانس کا مسئلہ تھا، نہ گھٹنے کا، بلکہ جوانوں کی طرح اوپر چڑھتے رہے اور ہم خواجہ صاحب کی قبر کے پاس پہنچ گئے، جہاں پر اولا قاری عبدالرحمن صاحب نے حسب سابق بہت عمدہ انداز سے تلاوت کی، پھر وہاں کے نائب امام اکمل خان نے بہت پرسوز آواز میں سورہ فرقان کی تلاوت، اس کے بعد مولانا طیب صاحب دامت برکاتہم (۱) نے دعا کروائی، پھر ہم مزار سے نیچے گاڑی کی طرف اترنے لگے، ابھی اس مزار کے احاطے کے گیٹ کے پاس پہنچے تھے کہ

مقامی لوگ قہوہ اور پھل تقسیم کرنے لگے اور کسی نے بتایا کہ اس مزار میں اکرام ضرور ہوتا ہے، یہاں کے لوگ آنے والے مہمانوں کا اکرام کرتے ہیں تو آپ بھی لے لیں، چنانچہ گروپ کے ساتھیوں نے بھی کچھ انگور وغیرہ لے کر اس اکرام سے حصہ حاصل کیا اور دعا کر کے روانہ ہو گئے۔

واپسی میں بھی اب نشیب زمین تھی نشیب میں جانا تھا، بزرگ حضرات کو گاڑی میں بٹھایا گیا اور جوان پیدل روانہ ہوئے، جب چوک کے پاس پہنچے تو ایک جم غفیر موجود تھا، جن میں سے کچھ تو گھروں کے دروازوں سے ہی دیکھ رہے تھے، کچھ آگے بڑھے کر مصافحہ اور سلام کرنے لگے، اور دعاؤں کی درخواست کرتے رہے، ایک شخص نے دکان سے کچھ چیزیں لے کر بعض حضرات کو ہدیہ دیں، دِکھنے میں ہدیہ تو معمولی سا تھا، لیکن ان کے خلوص نے اتنا وزنی کر دیا تھا کہ اس کا بوجھ شاید ہم شہروں کی زندگی میں مگن لوگ اٹھا نہ سکیں اور اس کا بدل ادا نہ کر سکیں۔

مدرسہ خواجہ امام بخاری رحمہ اللہ

یہاں سے روانہ ہو کر مغرب کی نماز کے لیے مدرسہ خواجہ امام بخاری رحمہ اللہ کے پاس رکے، سڑک کے کنارے بنا ہوا یہ خوبصورت سا مدرسہ جہاں حفظ اور درجہ کتب کے طلبہ زیر تعلیم تھے، بہت عمدہ اور اچھی عربی کے ساتھ ان میں جو چیز کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ ان کی علم اور علماء سے محبت تھی، کشادہ مسجد، جس میں بعض جگہ قالین بچھا ہوا تھا، ایک طرح کے لباس میں ملبوس یہ سارے طلبہ سروں پر ٹوپی سجائے ہوئے تھے، بعض نے باقاعدہ داڑھیاں بھی رکھ رکھی تھیں، نماز مغرب سے فارغ ہو کر علماء کی طرف ایسے لپکے جیسا بھوکا شخص جس نے کئی دن کا فاقہ کیا ہو اور اس سے مزید بھوک برداشت نہ ہو رہی ہو اور کافی عرصہ بعد اس کے سامنے اس کی من پسند ڈش رکھ دی گئی ہو اور وہ کھانے پر لپکتا ہے، طلبہ کی ان محبتوں اور چاہتوں کو دیکھ کر ہمارے گروپ کے بعض حضرات نے مائک پر ان سے کچھ بات بھی کی، جو قانوناً وہاں جرم ہے، وہاں بغیر اجازت کوئی مہمان کسی مدرسہ میں مائک پر کسی سے بات کرے یا ترغیب دے اس کی اجازت نہیں ہے، لیکن ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا اور طلبہ کی محبتیں اور دعا کی چاہت بھی ایسی تھی کہ مفتی احمد انور صاحب بات کئے بغیر شاید

ان سے رخصت ہونے کو بے وفائی سمجھے، اسی لیے چند جملے، مختصر وقت میں انہوں نے کہے جس سے بعد میں ہمیں معذرت کرنی پڑی کہ ہمیں اس بات کا علم نہ تھا ورنہ ہم قانون کی پاسداری کرتے ہوئے ہرگز طلبہ کے درمیان بات نہ کرتے۔

یہاں بھی طلبہ عربی بہت عمدہ بولتے اور سمجھتے تھے، بار بار طلبہ آکر گروپ کے مختلف علماء سے دعا کی درخواست کرتے رہے، اور بعض تو آنسوؤں سے اپنی طلب کی سچائی کی دلیل بھی دے رہے تھے، ہر طالب علم کی خواہش تھی کہ وہ استاد محترم کے ہاتھ کو پکڑ کر تبرکا خدمت کرنے کے لیے قبول کرلیے جائیں، لیکن کچھ طلبہ جو ان میں زیادہ تیز تھے وہ اس معاملے میں بازی لے گئے، ان کی لجاجت دیکھ کر بندہ استاد محترم کا ہاتھ انہیں تھمائے بغیر نہیں رہ سکا، پھر سب طلبہ بار بار ایک دوسرے سے درخواست کرتے بھی تھے، لیکن بعض طلبہ غالب ہونے کی وجہ سے آخر تک ہاتھ پکڑے بس تک پہنچ جاتے اور باقی ساتھ ساتھ چل کر اپنے دل کی چاہت پوری کرتے تھے، یہاں سے روانگی کی صورت بھی وہی حسرت بھری نگاہیں، عاجزی سے ایک طرف کو ڈھلکے ہوئے سر، تعظیم کے لیے کھلی ہوئی باچھیں، نہ چاہتے ہوئے بھی رخصت کرنے والے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھ، دوبارہ ملاقات کی چاہت کا اظہار کرنے والی آنکھیں تھیں، دل نہ چاہتے ہوئے بھی ان علم دوست طلبہ کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے اور یہ طلبہ دور سے بس کو جاتا ہوا دیکھتے رہے، اللہ تعالی انہیں اس علم کی محبت کی بنا پر علمی و عملی ترقی نصیب فرمائے اور ایک بار پھر ان کے ہاں علم کی بہاریں لے آئیں، اور انہیں دوبارہ اپنے علم و عمل دنیا کو سیراب کرنے والا بنادے۔

گھریلو مطاعم

مدرسہ خواجہ امام بخاری سے فارغ ہو کر ہم رات کا کھانا کھانے کے لیے مقامی ریسٹورنٹ پہنچے، یہ ایک گلی میں بنا گھر تھا جہاں پر لوگوں کے لیے کھانے وغیرہ تیار کیے جاتے تھے، صرف یہی نہیں، بلکہ ایسی بہت ساری جگہیں تھیں، جہاں کے لوگ اپنے گھر کو بطور ہوٹل (مطعم) استعمال کرتے تھے، یہ دکھنے میں تو گھر ہی تھے ان کی بناوٹ کسی ہوٹل کی طرح الگ سے نہیں کی جاتی تھی، بلکہ عام گھر کی طرح ہی ہوتا تھا، دیکھنے والا اگر انہیں

دیکھے تو ہوٹل بالکل بھی نہیں لگتے، لیکن اندر فرنیچر، بیٹھنے کے لیے رکھی ہوئی مختلف چیزیں بالکل کسی بڑے ہوٹل کی طرح ہوا کرتی تھیں، اس میں کام کرنے والے یا تو گھر ہی کے افراد ہوا کرتے تھے یا پھر شاید ملازمین بھی رکھ لیے جاتے ہوں، گھر کے کمروں کو بطور ہال استعمال کیا جاتا تھا، لوگ آکر کھانا کھاتے اور ادائیگی کر کے چلے جاتے تھے، بعض گھروں میں تو یہ بھی دیکھا کہ گھر کے اندر چھوٹا سا باغیچہ، کھیت بھی ساتھ میں موجود تھے، شاید سبزیاں بھی اپنے ہاں کی ہی پکاتے ہوں گے، پھل بھی بعض انہیں مکانات میں ہمیں نظر آئے، زرخیز زمین ہونے کی وجہ سے ہر چیز کی صلاحیت تو اس میں موجود ہی ہوتی ہے، لیکن ازبک قوم کی جفاکشی ان کی محنت و لگن نے انہیں اپنے گھروں میں بھی ان چیزوں کے لگانے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے پر مجبور کیا ہے۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ گھر کے افراد جس انداز سے خدمت میں مصروف تھے وہ ان کی جفاکشی کی دلیل ہے، گھر کے افراد کے لیے شاید کھانا تیار کرنے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا اس لیے انہوں نے باہر کے لوگوں کو کھلانا شروع کر دیا۔

ان ہوٹلوں کے اوقات بھی مخصوص ہوتے تھے بقول بھائی سنجار کے یہ ہوٹل نو بجے بند ہو جاتے ہیں، نو بجے کے بعد اس میں داخلہ نہیں ہوتا بس اسی پر ختم کر دیتے ہیں، اگرچہ آپ نے بکنگ کی ہو اور پہنچ نہیں پائے ہوں، ہمیں کچھ دیر ہو گئی تھی، لیکن ان سے وقت پہلے ہی لے لیا تھا اور بہت عمدہ انداز میں بنائے گئے کھانے ہم نے ان گھروں میں کھائے۔

ان ہوٹلوں میں اکثر ایک چیز دیکھنے کو ملی وہ ان کے ہاں کے برتن تھے جو یہاں کی دست کاری کا بہترین شاہکار تھے، ان کے گھر میں شوکیس یہاں کی ثقافتی بہت سی چیزوں سے بھری ہوتی تھیں، یہ صرف آنے والے مہمانوں کو دکھانے کے لیے رکھے ہوتے تھے یا گھریلو استعمال کے برتن تھے یا ان حضرات کا ذوق تھا، کچھ بھی تھا بہر حال تھا ضرور، جو نظر کو بھاتے تھے، اور ان کی جفاکشی اور فن تعمیر میں ان کی مہارت کے اعلان کرتے تھے۔

ان ہوٹلوں میں کھانا کھلانے کی وجہ جب معلوم کی تو پتہ چلا کہ یہاں ہوٹل اور بھی ہیں اور اچھے اچھے بھی ہیں، لیکن علماء کی شان کے مناسب نہیں کہ اس جیسے ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھانا کھائیں، کیونکہ ہر ہوٹل میں میوزک، ڈانس کلب، بار ضرور ہوتا تھا، جس سے شریف انسان کی ذات مجروح ہو سکتی تھی، اس لیے اس قسم کی کوئی چیز ان علماء کے سامنے نہ ہوں اس لیے گھریلو ہوٹلوں کو ہی ہمارے لیے چنا گیا تھا، اللہ کریم اس پر ان

حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

میجسٹک ہوٹل سمرقند

کھانے سے فارغ ہو کر ہم سمرقند میں اپنی قیام گاہ میجسٹک ہوٹل پہنچے، جہاں کا ماحول بہت ہی عمدہ تھا، شور شرابے سے دور ایک پر سکون ماحول میں بنا یہ ہوٹل سادگی کے ساتھ ساتھ خوبصورتی کا بھی شاہکار تھا، اس میں بھی حسب معمول بہت زیادہ بڑی عمارت نہ تھی، صرف تین منزلہ عمارت تھی، لیکن ہوٹل کی جگہ بہت کشادہ اور خوبصورت تھی، بندہ کو پھر استاد محترم کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر جگہ دی گئی، یہاں بھی موسم بہت خوش گوار تھا، صبح فجر کے بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، بندہ پیدل ٹہلنے کے لیے نکلا، اس ہوٹل میں چونکہ رات کو پہنچے تھے اس لیے باہر کا ماحول معلوم نہ ہو سکا اور اس کا محل و قوع بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا، لیکن صبح جب چہل قدمی کے لئے نکلا تو دیکھا کہ سڑک سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کشادہ گلی میں یہ ہوٹل بنا ہوا تھا، صبح کی چہل قدمی کا الگ ہی لطف تھا، صبح فجر کے بعد کا وقت تھا، لوگ بھی چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئے، کچھ لوگ گھر کے باہر بنے چھوٹے باغیچہ میں پانی دے رہے تھے، کچھ باغیچہ میں لگے پودوں کی تہذیب و درستگی میں مصروف تھے، چہل قدمی کرتے لوگوں میں بعض ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے گزر رہے تھے، گلیاں صاف ستھری، کشادہ تھیں، جگہ جگہ درخت لگے ہوئے تھے، اور پھولوں کی خوشبوؤں کا ایک الگ ہی لطف تھا۔

کچھ دیر چہل قدمی کر کے پھر سے ہوٹل جانے لگا تو پیر نصیر الدین عثمانی صاحب (رحمہ اللہ جو ہمارے سفر کے جبہ پہنے ایک ہنس مکھ انسان تھے تحریر کے چھپنے سے پہلے ہی دنیا سے عقبی کی طرف روانہ ہو گئے) بھی اس وقت چہل قدمی کے لیے نکل چکے تھے، وہاں کی چہل قدمی اور صبح کی ہوا بہت پر سکون اور شفا بخش تھی، جس کا اندازہ وہیں جا کر لگایا جا سکتا ہے، ویسے بھی سمرقند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

سمرقند صیقل روئے زمین است

بخارا قوت اسلام و دین است

آج ہمیں ہوٹل سے ناشتہ کر کے امام بخاری رحمہ اللہ کے مزار کی طرف جانا ہے، سب ساتھی ناشتہ

وغیرہ سے فارغ ہو کر لاؤنج میں پہنچ چکے تھے، ہم بھی روانگی کے لیے بس میں بیٹھ گئے یہاں سے ہمیں امام بخاری رحمہ اللہ کے مزار جانا تھا جو مقام خرتنگ (سمرقند ہی کے علاقے) میں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا مزار

امام بخاری رحمہ اللہ کا مزار مقام خرتنگ میں واقع ہے، جو سمرقند سے ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، جہاں پر اب چھوٹی بستی بھی آباد ہے، سمرقند شہر سے دور یہ علاقہ اگرچہ بہت کم تعداد پر مشتمل بستی ہے، لیکن علم حدیث کے جس پہاڑ کو زمین دے رکھی ہے وہ اس فن میں آسمان کی حیثیت رکھتے ہیں، گویا اگر یوں کہا جائے کہ خرتنگ کی زمین وہ زمین ہے جس نے آسمان کو اپنے اندر چھپایا ہے تو بے جا نہ ہو گا، اور شاعر نے بہت ہی خوب کہا ہے زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سو ہم بھی اسی زمین کو دیکھنے آئے تھے جہاں رئیس المحدثین حضرت امام بخاری علیہ الرحمہ نے اپنے آخری ایام گزارے، شاہان وقت نے ڈر وخوف کی وجہ سے جب امام المحدثین کو علمی مراکز میں جگہ نہ دی تو اس وقت اسی مقام خرتنگ نے انہیں حیاً ومیتاً اپنی آغوش میں پناہ دی اور حضرت امام نے اسی مقام پر آکر اپنی آخری سانسیں پوری کیں۔

یہاں پہنچے تو دیکھا کہ حکومت نے اس کے لیے الگ سے خوبصورت عمارت بنا رکھی ہے، بہت خوبصورت احاطہ تھا جس میں تین چیزیں موجود تھیں: (۱) امام بخاری رحمہ اللہ کا مزار (۲) مسجد، (۳) مخطوطات اور دیگر علمی کتابیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا مزار

امام بخاری رحمہ اللہ کا مزار اس احاطے میں کسی بڑے ہال میں نہیں، بلکہ ان کا مزار کھلی فضا میں ہے، جس کے اوپر ایک چبوترا بنایا گیا ہے، اس کے ساتھ کی پوری جگہ خالی چھوڑی گئی ہے، یہ صحن میں بنے چبوترے میں بنی قبر زمین کے اوپر ایک علامتی قبر ہے، اصل قبر زیر زمین بنائے گئے کمرے میں ہے، جو صرف بادشاہوں،

وزیروں اور سرکاری لوگوں کے لیے کھولا جاتا تھا، لیکن بعض سفر ناموں سے معلوم ہوا ہے کہ کچھ حضرات کے لیے یہ دروازے کھولے گئے ہیں، ہمارے گروپ میں موجود اکابر کی برکت سے امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مزار ہمارے لیے بھی کھولا گیا، دیگر لوگ بڑی حسرت سے دیکھتے رہے، کچھ لوگ انڈونیشیا سے آئے تھے، انہیں بھی اس گروپ کی برکت سے اندر جانے کا موقع ملا، وہ بھی بہت خوش ہوئے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی قبر زیادہ اونچی نہیں، بلکہ معمولی سی اونچائی میں بنائی گئی قبر ہے جو اپنی سادگی کے ساتھ ایک عظیم علمی وروحانی شخصیت کو اپنے اندر جگہ دینے کا شرف رکھتی ہے، جس کے لیے عزت وشرف وفخر کی بات یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ جیسے عظیم محدث اس مٹی میں آسودہ خاک ہیں۔(۱)

اللہ تعالی کے ہاں امام بخاری کا مقام ومرتبہ کیا ہے اس کا اندازہ تو خود انہیں ہی ہو گا، علم حدیث کے لئے ان کی خدمات اور احادیث مبارکہ کو اتنا منقح پیش فرمانا، چالیس احادیث کو یاد کرنے کے لئے جنت کی بشارت دی اور انہوں نے احادیث مبارکہ کے انتخاب کے لئے لاکھوں سندیں یاد کیں اور ان میں سے صحیح ترین احادیث کو چن کر اپنی کتاب میں جمع فرمایا، اس پر اللہ تعالی کی طرف سے انہیں جو مقام ملے گا، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں، البتہ دنیا میں امام بخاری رحمہ اللہ کو اللہ تعالی نے یہ مقام عطا فرمایا کہ وہ امام بخاری جنہیں حاکمانِ وقت نے دھتکارا، اور کسی جگہ پر ٹھہرنے نہیں دیا، اللہ تعالی نے دنیا میں ایسا معاملہ فرمایا کہ لوگوں نے ان کی مقام مرتبہ سے بڑھ کر ان کی باتیں ذکر کرنا شروع کر دیں، خود امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے بارے میں جو باتیں ذکر نہیں کیں تھیں، لوگوں نے وہ باتیں بھی ان کی طرف منسوب کر دیں، ان کی جلالت شان کا یہ حال ہے کہ لوگ ان کے بارے میں اب کوئی نقص والی بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، جنہیں اللہ تعالی نے ان کی موت کے بعد لوگوں کے ذہنوں پر ایسی حکومت نصب فرمادی ہو تو یقینا قیامت کے دن بھی ان کے ساتھ عفو اور تعظیم کا معاملہ بندگان خدا کے گمان سے بھی بڑھ کر فرمائیں گے، اللہ تعالی ہمیں بھی قیامت کے دن ان کے رفقاء ومصاحبین میں سے بنادے اور اعلی علیین میں انہیں جگہ عطا فرمائے، لوگوں نے امام صاحب کے بارے میں بعض وہ باتیں

---

(۱) امام بخاری رحمہ اللہ کے مزار کے بارے میں بعض سفر ناموں میں یہ بات ذکر کی ہے کہ ان کے مزار کے بارے میں یہاں کوئی نشانی وغیرہ نہ تھی، ۱۹۶۰ میں جب ملائیشیا کے صدر یہاں آنا چاہ رہے تھے تو روسی حکام سے کہا کہ میں امام بخاری رحمہ اللہ کے مزار پر جانا چاہتا ہوں، تو انہوں نے جلدی سے اس قبر کو دریافت کیا اور اسے جلدی سے ترتیب دے کر وہاں تک بھجوایا۔

منسوب کر دی ہیں جس سے بظاہر ان کی شان بڑھے گی، لیکن امام صاحب کی ذات اس سے بڑھ کر ہے کہ ان کے فضائل ذکر کرنے کے لئے غیر مستند باتیں ذکر کیں جائیں، جو فضائل اللہ تعالی نے انہیں عطا فرمائے تھے وہ اپنی جگہ مضبوط و مسلم ہیں، اور لوگ جو دعوی کرتے ہیں ان میں سے بہت سے دعوؤوں سے امام صاحب بری الذمہ ہیں اور لوگ اس قدر غلو کر جاتے ہیں کہ اب لوگ اصل بات جو ان دعوؤں کے برعکس ہے وہ سننے کے لیے بھی تیار نہیں، لیکن ظاہر ہے امام بخاری رحمہ اللہ کا دامن اس سے پاک ہے، انہوں نے وہ دعوے کیے ہی نہیں تھے، البتہ بعد کے لوگوں کے دعوؤں کی تردید یا کم از کم اصلاح ضروری ہے؛ کیونکہ اسلام میں مبالغہ آرائی کی گنجائش نہیں ہے، خود آپ علیہ السلام نے اپنے بارے میں محتاط رہنے کا حکم دیا ہے، تو کسی امتی کے بارے میں مبالغہ کیسے درست ہو سکتا ہے، لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے علم حدیث (جو دین کا دوسرا مأخذ ہے) اس کے لیے جو انتھک محنت کی اور اس کی ترویج کے لیے دوسرے محدثین کی طرح جو کوششیں کی ہیں، وہ امت کے بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہیں، اللہ تعالی کی طرف سے انہیں حافظہ بھی اچھا ملا جس کی وجہ سے انہوں نے احادیث مبارکہ کو بخوبی یاد رکھا اور امت تک پہنچایا۔

ہمیں تو اس پر خوشی تھی کہ اتنی عظیم الشان محدث کی قبر مبارک پر اللہ تعالی نے حاضری نصیب کی، ہمیں تو بس اسی کی خوشی تھی، کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی طرف منسوب قبر کے پاس موجود تھے، بخاری شریف کی ایک حدیث کی قراءت بھی کی، صاحب قبر اور اس کے احوال سے واقفیت چونکہ ہمارے اختیار میں نہیں، اس لیے کسی کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا، لیکن ہر قبر اور ہر مزار کی کیفیات الگ رہتی ہیں جو کبھی محسوس ہو جایا کرتی ہیں اور کبھی نہیں۔

مزار پر حاضری کے بعد سب رفقاء سفر مسجد چلے گئے، پہلے دو رکعت نفل پڑھ کر ساتھیوں نے دعا کی، پھر استاد محترم مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم کا سبق ہوا، جس میں ابتداء بندہ نے استاد محترم کی سند پڑھ کر سنائی جو استاد جی کے ''ثبت النعماني'' میں مولانا محمد بن اسلم صدیقی صاحب نے ذکر کی ہے، اس کے بعد مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم اور مولانا مفتی حسن صاحب مدظلہ العالی نے بخاری شریف کی حدیث اول کی عبارت پڑھی، جب کہ مولانا ادریس سومرو صاحب اور مفتی طاہر مسعود صاحب نے آخری حدیث پڑھی، استاد محترم نے سب علماء شرکاء کو بخاری شریف کی اجازت بھی مرحمت فرمائی، اس کے بعد بعض علماء نے دستار

بندی کی خواہش ظاہر کی تو استاد محترم، مولانا طیب صاحب، مولانا محمد حسن صاحب، مفتی طاہر مسعود صاحب، مولانا شیر جان صاحب، قاضی ارشد الحسینی صاحب وغیرہ بزرگوں نے بعض علماء جنہوں نے خواہش ظاہر کی تھی ان کی دستار بندی کی، جن میں خصوصی طور پر مفتی رضوان عزیز صاحب، مفتی احمد صاحب، مولانا سلمان انبالوی صاحب، مولانا ادریس سومرو صاحب مولانا نذیر صاحب، مولانا ثناء اللہ صاحب، مولانا عبد اللہ شاہ مظہر صاحب وغیرہ شامل تھے۔

یہاں سے فارغ ہو کر سب اسی احاطے میں موجود مکتبہ و موزیم چلے گئے، جہاں پر مختلف کتابیں، مخطوطات، ہدایا و تحائف جو وہاں کے لئے مختلف حضرات نے دیں تھیں وہ جمع کروائیں تھیں، جن میں انڈونیشیا، ملائیشیا اور دیگر سربراہان مملکت کی ہدایا خصوصی طور پر نظر آئے، مخطوطات بھی مختلف کتابوں کے موجود تھے، جن میں تفسیر، حدیث اور دیگر موضوعاتی مخطوطات بھی شامل تھے۔

مزار میں مختلف جگہوں پر باغیچے بنے ہوئے تھے، جس میں کام کرنے والے مرد وزن مختلف پھولوں والے پودے لگانے میں مصروف تھے، ان کے پودے لگانے کا انداز بھی بہت عمدہ تھا، چھوٹے چھوٹے باغیچے گولائی میں بنائے گئے تھے، اس کے کنارے کنارے ترتیب سے پودے رکھ دیئے گئے تھے، جس کے لیے جگہ بنا کر یہ آدمی تیزی سے پودے لگاتے جارہے تھے، ہمیں دیکھ کر ابتداء ان کام کرنے والے افراد نے اپنا کام روک دیا تھا، اور ایک طرف ہو کر کھڑے ہوئے، جب ہم ایک طرف سے گزر کر دوسری طرف چلے جاتے تو پہلی طرف کے لوگ اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے، بہت خوبصورت پودے باغیچے کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔

مزار میں آنے والے چونکہ صرف مسلمان نہیں تھے، بلکہ دوسرے لوگ بھی شامل تھے، اس لیے ان بڑی جگہوں میں اہل علم سے زیادہ دوسرے ٹورسٹ ہی نظر آتے تھے، مختلف ممالک سے آئے یہ ٹورسٹ صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں، جس طرح دیگر مقامات پر ہمیں علماء مشہور جگہوں پر نظر آئے اس طرح ہمیں امام بخاری رحمہ اللہ کے مزار کے پاس نظر نہیں آئے، اس کی وجہ جو بھی ہو تاہم یہ ضرور محسوس کیا کہ علماء اور اہل علم یہاں بہت کم تعداد میں تھے، ہمارے ساتھ پروٹوکول میں آئے علماء تو شامل تھے، لیکن یہاں کے مقامی علماء زیادہ نظر نہیں آئے۔

مزار کے احاطے میں چاروں طرف چنار کے درخت تھے، ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور چنار کے درخت کے پتے اپنی پوری جوبن میں آوازیں نکال رہے تھے ایک بارعب مزار میں بارعب سی آواز تھی جو ہیبت وو قار میں مزید اضافہ کرر ہی تھی، ہوا بھی خوب ٹھنڈی تھی، اور تیز بھی، مزار سے فارغ ہو کر فوراً بس میں بیٹھنے کی کوشش کی اور یہاں سے ہمیں دوبارہ اپنے ہوٹل میجسٹک جانا تھا، جہاں سے ہمیں سمرقند شہر کی کچھ سیر کرنی تھی جس میں سر فہرست حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کا مزار بھی شامل تھا۔

حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ

امام بخاری رحمہ اللہ کے مزار کے بعد ہم سمرقند پہنچے، جہاں شاہ زندہ قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کا مزار تھا، حضرت قثم ابن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے، ان کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور بھائی حضرت عبد اللہ بن عباس، فضل بن عباس، عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم تھے، ان کی والدہ لبابہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کی عمر بہت کم تھی البتہ ظاہری موت کے وقت یہ سن شعور کو پہنچ چکے تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں خراسان کی لڑائی میں قیادت فرمارہے تھے اور سمرقند کے علاقے میں جام شہادت نوش کی، ان کا مزار سمرقند شہر میں ہے جو آج بھی مرجع خاص و عام ہے، انہیں شاہ زندہ بھی کہتے ہیں۔

شاہ زندہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی شہادت کے بعد زندہ رہے جب تک اپنے قاتل سے بدلہ نہ لے لیا، یہ ان کے اپنے افسانوی قصہ کہانیوں کا حصہ ہے۔

عین ممکن ہے کہ انہیں شاہ زندہ اس لیے کہا جاتا ہو کہ شہید چونکہ زندہ رہتا ہے مرتا نہیں ہے اور یہ شہید ہوئے تھے اس لیے شاہ زندہ کہا جاتا ہو۔

حضرت قثم بن عباس رضی اللہ کا مزار

ان کا مزار بہت اونچائی پر بنایا گیا ہے، مزار کی طرف جاتے ہوئے پہلے پارکنگ اس کے بعد بیت الخلاء،

دکانیں، پھر بہت اونچی سیڑھیاں ہیں، جس کے بعد ایک کشادہ احاطہ ہے، جس میں مختلف کمرے بنے ہوئے ہیں، ان کمروں میں مختلف بادشاہوں، ان کے وزیروں کے علاوہ بعض سماجی افراد کی قبریں بھی بنائی گئی ہیں، اس کے علاوہ ایک کمرے میں حضرت سیدنا قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کا مقبرہ ہے، لیکن اس مقبرے تک پہنچنے کے لیے پہلے لمبی چوڑی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں، جس کے بارے میں یہاں کے لوگوں میں مشہور ہے کہ جو مزار کی طرف جاتے ہوئے سیڑھیاں گنے اور واپسی میں پھر گنے اور دونوں بار تعداد یکساں ہو تو اس آدمی کی مغفرت ہو جاتی ہے، اس شہرت کا نتیجہ یہ نکلا بہت سارے لوگ اسے گن رہے تھے، بلکہ بعض لوگ تو کئی مرتبہ بھی اس کا چکر لگاتے رہے۔

ایک ساتھی نے بھائی سنجار سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''بظاہر یہ اس لیے مشہور کیا گیا، تاکہ لوگ زیادہ اونچا ہونے کی وجہ سے مزار پر جانا نہ چھوڑ دیں'' اس لیے ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی، ہمارے بعض ساتھیوں نے بھی یہ سیڑھیاں گنیں، بعد میں جب معلوم کیا تو پتہ چلا کہ مسلسل چھتیس ہیں اور اگر ان کے ساتھ آرام کے لیے بنائی جگہوں کو بھی شامل کریں تو ۴۰ سیڑھیاں ہیں۔

مزار کی سیڑھیاں چونکہ زیادہ تھیں اور اونچائی بھی تھی اس لیے بعض احباب نے استاد محترم سے درخواست کی کہ جگہ زیادہ اونچی ہے آپ یہیں آرام فرمالیں، تو جہد و مشقت کے عادی اس بوڑھے پہاڑ نے بندے کو آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا چلو میاں ہم بھی چلیں گے، کیوں نہیں جائیں ہم، اور پھر تیز رفتاری کے ساتھ اوپر کی طرف چلنا شروع کیا، سیڑھیاں چلنے کے لیے لوگوں کے پاس تو شاید گننے کا نظریہ یا کم از کم ایک معمولی تفریحی عمل موجود تھا، لیکن بندہ کے پاس ہمت و حوصلہ بڑھانے والے نہ صرف حکیم موجود تھے، بلکہ خود ہمت و حوصلہ کے زبردست معجون بھی موجود تھے، جو بندے کو اپنے ساتھ اس تیزی سے لے گئے کہ بندہ بجائے سیڑھیوں اور اس کے اونچائی کو دیکھنے کے یہی دیکھتا رہا کہ اس ضعیف العمری میں اس تیزی سے ان سیڑھیوں پر چڑھنا کیسے ممکن ہے، یقینا اس میں ان کی غذا میں احتیاط کے ساتھ ساتھ ان کی روحانی قوت کا بھی بڑا دخل تھا جو اس عمر میں بھی ان کو اس طرح ہمت واستقلال کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

مزار کی سیڑھیاں استاد محترم بلا آرام کیے ہوئے چڑھ کر ماشاء اللہ اوپر تک پہنچ گئے، نہ کہیں رکنے کی ضرورت پڑی، نہ کسی جگہ ستانے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت پڑی، بلکہ رفقاء مجلس میں سے کافی حضرات

سے پہلے ہی استاد جی مزار تک پہنچ گئے اور استاد محترم کی وجہ سے بندہ بھی۔

یہ مزار ایک مستطیل احاطے میں بنا تھا، جس کی طرف جانے کا رستہ کسی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا، دو طرفہ جگہیں ایسی بنی تھیں جیسے کسی زمانے میں دکانیں رہی ہوں، اس مزار کے احاطے میں ایک تاریک سا راستہ تھا، جس سے گزر کر ہمیں حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دینی تھی، چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں بھی وہی ازبکستان کے مزاروں والا حال تھا، نہ رونا دھونا، نہ سجدے، نہ کوئی اور غیر شرعی کام تھا، یہاں بھی وہی حال تھا، کہ قبر کو ایک کمرے میں بند کیا گیا تھا، قبر کے گرد جالیاں تھیں جس سے لوگ قبر کو دیکھ سکتے تھے، لیکن کمرے میں اندر جانے کی اجازت نہ تھی، بلکہ دیگر مزاروں کی طرح یہاں بھی باہر ہی بنچوں پر بیٹھ کر ایصال ثواب کرنے اور واپس چلے جانے کی ترتیب تھی۔

یہ کمرہ صرف بادشاہوں، وزراء اور سیاسی لوگوں کے لیے کھولا جاتا ہے، یا پھر خصوصی کسی فرد یا وفد کے لیے، ہمارے وفد میں موجود علماء کی برکت سے اللہ تعالی نے ہمیں بھی قبر کے پاس حاضری نصیب فرمائی، جو بظاہر مشکل کام تھا، کمرے کے اندر جا کر دعا وغیرہ کی اور ایصال ثواب کر کے واپس آگئے اور باہر ان کے بارے میں سوچتے رہے کہ کیسی زندگی گزاری، کہاں پیدا ہوئے کہاں ان کا انتقال ہوا، کیسے اذیت و تکالیف والی زندگیاں گزار کر یہ حضرات اللہ کے ہاں حاضر ہوئے، کسی نے شہادت حاصل کی، کوئی تعلیم دین میں مصروف رہ کر اس دنیا سے کوچ کر گئے، ایک عجیب سا تصور تھا، اک عجب سے سماں تھا، جس کے بارے سوچتے سوچتے واپسی ہوئی۔

ماشاء اللہ استاد محترم مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب بغیر آرام کیے ہوئے اوپر چڑھے اور پھر واپسی میں بھی بغیر آرام کیے واپس اترے، نہ سانس پھولا، نہ آرام کرنے کی ضرورت پیش آئی، نہ کوئی اور تکلیف ہوئی، رستے میں بندہ نے درخواست کی کہ استاد جی کس ستالیں تو پھر واپس ہو جاتے ہیں، فرمانے لگے میاں: "کاہے کا ستانا، ہمیں کوئی ضرورت نہیں، چلو چلتے ہیں"، اور بنا توقف کیے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے، راہ چلنے والے افراد جن میں کچھ انگریز اور کچھ دیگر ممالک کے لوگ بھی شامل تھے، جب استاد محترم کو دیکھتے تھے تو فوراً عمر کے بارے پوچھتے تھے، جب انہیں عمر بتادی جاتی تو تعجب کرتے اور آگے چل دیتے تھے، جو مسلمان تھے وہ تو سلام بھی کرتے اور دعا کی درخواست بھی۔

اسی احاطے میں ایک مسجد بھی تھی، جب تک ہم اوپر تھے تب تک نماز کا وقت نہیں ہوا تھا، جب نیچے اتر آئے تو ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا، مسجد بھی اوپر تھی، اور ساتھ میں وضو خانہ بھی نہیں تھا، وضو خانہ باہر دور بنا ہوا تھا، اس لیے بندہ کو مناسب نہیں لگا کہ وضو کے بعد استاد محترم کو اتنی اونچائی پر دوبارہ لے جایا جائے، جب وضو فرمالیا تو بندہ نے چاہا کہ قریب بنے چھوٹے سے باغیچہ میں ہی کھڑے ہو کر استاد محترم کے ساتھ جماعت کروالی جائے، تا کہ نماز ادا کر سکیں، لیکن پھر یاد آیا کہ کچھ چیزیں یہاں قانونا درست نہیں، اور کوئی کام خلاف قانون کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے رومال بچھانے سے پہلے ساتھ میں موجود عملہ کے فرد سے پوچھ لیا کہ یہاں نماز کی اجازت ہے یا نہیں؟ پروٹوکول میں موجود شخص نے جلدی سے کہا کہ پڑھ لیں کوئی مسئلہ نہیں، لیکن عملہ کے اس فرد نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ "پبلک پلیس" میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، مسجد میں جا کر پڑھیں، استاد محترم نے جب یہ سنا تو فورا منع کر دیا اور فرمایا کہ آگے چل کر پڑھ لیں گے، جب منع ہے تو یہاں نہیں پڑھنی، (حالانکہ نماز کے معاملے میں استاد محترم بہت حساس تھے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا کہ بار بار پوچھتے تھے کہ نماز کب پڑھنی ہے، باوجود وقت داخل نہ ہونے، لیکن اس کے باوجود جب دیکھا کہ اجازت نہیں تو اس جگہ نماز نہیں پڑھی) ہم نے وہاں نماز پڑھنے کے بجائے جہاں کھانا کھانے رکے وہیں پر نماز پڑھنے کی ترتیب بنائی۔

ریگستان چوک

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم وہاں موجود سہہ مدارس دیکھنے کے لیے پہنچے، جو چودھویں صدی کی مشہور منڈی ریگستان چوک میں واقع تھی، اس چوک میں تین مدارس تھے جسے سہہ مدارس کے نام سے جانا جاتا ہے، جن میں مدرسہ الغ بیگ، مدرسہ شیر در، مدرسہ طلہ کاری شامل تھے، اس میں موجود یہ مدارس اس زمانے میں وفور علم کی واضح دلیل ہے۔ یہ ایک عوامی چوک تھا جہاں لوگ شاہی اعلانات سننے جمع ہوا کرتے تھے (وکی پیڈیا)۔ یہ چوک شہر سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

مدرسہ الغ بیگ

امیر تیمور کے پوتے مرزا الغ بیگ جو بہت بڑے ریاضی دان، فلسفی اور ماہر علم نجوم بھی تھے، انہوں نے فلکیات سے متعلق بہت سارے ایسے قواعد ذکر کیے ہیں، جن سے آج بھی سائنسی دنیا میں فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، الغ بیگ شہزادے ہونے کے باوجود علم دوست بھی تھے، سب کچھ موجود ہونے کے باوجود انہوں نے تعلیم وتربیت کو ترجیح دی اور یہ مدرسہ ۱۴۱۷ء سے ۱۴۲۰ء کے دوران بنوایا، نہ صرف مدرسہ بنایا، بلکہ مدرسہ میں خود تدریس بھی کرتے رہے، انہوں نے اسی مدرسہ میں ایک رصد گاہ بھی بنوائی تھی، جو تاریخ کی پہلی رصد گاہ تھی، اس کے ساتھ ساتھ تعمیر میں اس بات کا خیال رکھا کہ عمارت میں اس طرح کے دروازے بنائے جائیں کہ ہر دن کا سورج الگ الگ دروازے سے طلوع ہو، یہ ملکہ مرزا الغ بیگ کو حاصل تھا، کافی زمانے تک مرزا الغ بیگ اس مدرسہ میں خود پڑھاتے رہے۔

مدرسہ شیر در

مدرسہ الغ بیگ کے ایک صدی کے بعد سمرقند کے حاکم بالانگ دوش بہادر نے اسی کے سامنے ایک مدرسہ بنایا جس پر شیر اور ہرن کی تصویر کندہ کروائی اور اس مدرسہ کا نام مدرسہ شیر در مشہور ہوگیا۔

مدرسہ طلہ کاری

یہ مدرسہ بھی انہیں کے ساتھ واقع تھا اور اس میں اندر کی طرف کئی من سونے سے طلہ کاری کی گئی ہے، جو فن تعمیر کا عظیم شاہکار ہے، اس وجہ سے یہ مدرسہ "طلہ کاری" کے نام سے مشہور ہوگیا۔

مقبرہ محمدیین

ریگستان چوک سے فارغ ہو کر ہم ٹیکسیوں میں بیٹھ کر محمدیون کے مقبرہ چلے گئے، جہاں امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ (متوفی) کا مزار بھی ہے، یہ وہ قبرستان ہے جس میں دفنانے کے لیے دو شرطیں ہوا کرتی تھیں: ا۔نام محمد ہو ۲۔بڑے محدث ہوں، اس میں محمد نامی چار سو علماء مدفون ہیں۔

روسی تسلط کے دور میں انہوں نے محمدیون کے مقبرے پر بلڈوزر چلا کر اسے ختم کر دیا تھا، اور وہاں باغیچہ وغیرہ بنالیا گیا تھا، لیکن کسی مسلمان نے امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کے مزار کے ساتھ اپنا گھر بنایا اور ان کی قبر کو اس کے کمرے میں چھپا دیا جس کی وجہ سے وہ روسی استبداد سے محفوظ رہ گیا، بعد میں جب روسی تسلط ختم ہوا تو اسے دوبارہ مزار کی شکل میں بنا دیا گیا۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا مزار

محمدیون کے مقبرے میں ہی امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا مزار بھی ہے، جن کا اصل نام محمد بن محمد بن محمود ہے، ابو منصور کنیت ہے امام صاحب اسی نام سے مشہور ہوئے ہیں، ان کی بہت سی کتابیں ہیں، جن میں کتاب التوحید، بیان وھم المعتزلۃ وغیرہ کتابیں بھی شامل ہیں، ان کا مزار بہت سادگی سے بنایا گیا، امام ابو منصور ماتریدی کی طرف اہلسنت والجماعت کا ایک بہت بڑا طبقہ منسوب ہے، جس طرح ایک طبقہ امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے اسی طرح ایک طبقہ امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، حنفیہ فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور عقائد وکلام میں امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کے تابع ہیں، ابھی بھی ازبکستان میں امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ ہی کے متبعین ہیں، جو عقائد میں ذرا بھی لچک کے قائل نہیں، امام صاحب کی قبر پر پہنچ کر بھی ایک عجیب سی کیفیت تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک بار پھر علم کلام کا حلقہ لگا ہے، جس میں بڑے بڑے محدثین اور علم کلام کے چاہنے والے موجود ہیں اور امام صاحب اپنا درس دے رہے ہیں، طلبہ کے اشکالات کے جوابات اور ان کی عقل وفہم کے مطابق کام کو آگے بڑھا رہے ہیں، یہاں فاتحہ خوانی سے

فارغ ہو کر ہم محمدیون کے مقبرے کے بیچ میں آکر کھڑے ہوگئے جہاں پر ابھی کسی قبر کے آثار موجود نہیں ہیں، چشم تصور میں ان چار سو علماء کے بیچ میں خود کو پایا جو نہ صرف پائے کے علماء تھے، بلکہ ان میں سے ہر ایک کا نام ''محمد'' بھی تھا، اگر کسی امام میں یہ دو صفات نہ ہوتیں وہ اس مقبرے میں دفن نہیں کیا جاسکتا تھا، چنانچہ امام برھان الدین علی المرغینانی صاحب ہدایہ کا جب انتقال ہوا تو ان کے لیے اس مقبرے میں جگہ بنانے کی کوشش کی گئی لیکن اجازت نہ مل سکی؛ کیونکہ وہ پائے کے عالم ضرور تھے، لیکن ان کا نام محمد نہیں تھا، صاحب ہدایہ کا نام چونکہ علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل الفرغانی المرغینانی تھا، صاحب فضل و کمال ہونے کے باوجود صرف نام محمد نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اس قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں ملی، امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا نام چونکہ محمد بن محمد بن محمود ابو منصور تھا اس لیے انہیں یہاں دفن کیا گیا تھا۔

محمدیون کے مقبرے میں کھڑے ہو کر ان کے لیے دعا کی، بلکہ ان کی برکت سے اپنے لیے بھی دعا کا اہتمام کیا؛ کیونکہ محدثین کا یہ مقبرہ تجربہ سے ثابت ہے کہ دعاؤں کی قبولیت کے لیے اچھی جگہ ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کی قبر کے پاس سے فارغ ہو کر ارادہ کیا کہ صاحب ہدایہ کی قبر کے پاس بھی حاضری ہو جائے، لیکن کچھ اعذار کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، اور ہم حضرت دانیال علیہ السلام کی یادگار کی طرف جانے کے لیے روانہ ہوئے، عصر کی نماز کے لیے قریب میں ہی ایک مسجد میں چلے گئے جو کوئی سو سال پرانی تھی، اس میں بہت بڑے بڑے حوض بنے تھے اور مسجد بہت سادگی کے ساتھ لیکن بہت عمدہ بنائی گئی تھی، جس کی دیواروں پر فارسی میں اشعار وغیرہ کندہ تھے، ساتھیوں نے اس پر کندہ اشعار میں ان کی تاریخیں دیکھنی شروع کیں اور کچھ تاریخیں سمجھنے میں کامیاب بھی ہوگئے، لیکن تمام کندہ کی ہوئی تحریریں سمجھ نہیں پائے، کیونکہ ان کے خط بھی فن خطاطی کا شاہکار تھے، جو خط دیوانی وغیرہ میں بھی لکھے تھے، اور ہمیں سمجھ نہ آسکے، جب ہم نماز سے فارغ ہو کر جانے لگے تو ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے استاد محترم کے سامنے کچھ پھل اکراما پیش کیے، جس میں سے کچھ ہم نے لے لیے، لیکن وہ مصر تھا کہ آپ نے بہت کم لیا ہے اور بھی لے لیں، لیکن ان کی محبت اپنی جگہ تھی استاد محترم کھانے میں محتاط بہت رہا کرتے تھے، اگرچہ معدہ ماشاء اللہ ایسا پایا تھا کہ سب کچھ کھاسکتے تھے، لیکن احتیاط بہت فرمایا کرتے تھے۔

حضرت دانیال علیہ السلام کی یادگار

امیر تیمور کے بارے میں بھائی سنجار نے یہ بتایا کہ وہ ایک جگہ حملہ کرنے گئے، کافی دن گزرنے کے باوجود وہ جگہ فتح نہیں ہو رہی تھی، تو انہوں نے سبب معلوم کیا، جس پر انہیں بتایا گیا کہ یہاں حضرت دانیال علیہ السلام کی قبر ہے، جس کی وجہ سے اس جگہ کی حملہ آوروں سے حفاظت کی جاتی ہے، تو امیر تیمور نے اس شرط پر حملہ ختم کر دیا کہ اس قبر میں سے کچھ ہمیں دے دو، تاکہ ہم بھی اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں، اور وہ (بھائی سنجار کے بقول ان کے جسم کا کچھ حصہ لے کر یہاں آگئے اور اسے یہاں دفنایا گیا، اور دیگر حضرات کے بقول امیر تیمور کی عادت تھی کہ اس طرح کے مقدس ہستیوں کی قبر سے مٹی اٹھا کر اپنے ملک لایا کرتے تھے اور اسے دفنا دیا کرتے تھے، یہاں بھی وہ) قبر کی مٹی لے آئے اور یہاں دفنا دی، جس کے لیے طویل مرقد نما جگہ بنائی گئی ہے اور لوگ اسے دانیال علیہ السلام کی قبر قرار دیتے ہیں۔

یہ یادگار بھی ایک اونچے ٹیلے پر بنی ہوئی ہے، صاف ستھرا ماحول جو کہ پورے ہی ازبکستان میں نظر آیا، یہاں بھی وہی صفائی اور پر فضا ماحول میں ایک بہت خوبصورت احاطہ بنایا گیا تھا، جس میں ایک نہر (جس میں بندہ کے خیال کے مطابق گندہ پانی تھا یا پھر ان حضرات کے بقول وہ نہر) نمکین پانی کی تھی، باغیچے بہت خوبصورت بنے ہوئے تھے، اور بہت خوبصورتی کے ساتھ سیڑھیاں بنائی گئی تھیں جو یادگار دانیال علیہ السلام کی طرف جارہی تھیں، لیکن یہ سیڑھیاں تھیں بہت اونچی اور بہت زیادہ، بعض ساتھیوں کی رائے یہاں بھی یہی تھی کہ استاد محترم کو اوپر جانے کی تکلیف نہ دی جائے، بلکہ یہیں گاڑی میں رہنے دیا جائے، لیکن استاد جی کی جوان ہمتی، عزیمت سے سرشاری، اور اس پر مستزاد حضرت مدنی رحمہ اللہ جیسے مجاہد کی شاگردی یہ کہاں گوارا کرتی کہ وہ پیچھے رہیں، چنانچہ استاد جی چل دیئے وہ بھی تیزی سے، اور بلا کسی آرام کیے ماشاءاللہ اس یادگار تک پہنچ گئے اور پھر واپسی میں بھی بغیر کسی تھکان کے اتر گئے۔

استاد محترم کا ہاتھ چونکہ مولانا یاسر صاحب نے پکڑ رکھا تھا اس لیے بندہ مولانا حسن صاحب دامت برکاتہم کے ساتھ اترنے لگا؛ کیوں کہ وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ استاد محترم کے پیچھے پیچھے چلیں، بندہ نے ان سے ایک سوال کیا کہ حضرت یہ کیا وجہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے مزار پر جو کیفیت تھی وہ ہر جگہ نصیب

نہیں ہوئی؟، تو فرمانے لگے: ”ضروری نہیں کہ ایک ہی کیفیت ہر جگہ نصیب ہو بسا اوقات اسی جگہ پر کیفیت نصیب ہو جاتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی کیفیت نہیں بنتی، بلکہ بعد میں جب انسان اپنے کاموں میں مشغول ہوتا ہے تو اسے ان حاضریوں کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، مثلاً: کام میں برکت، دلجمعی کا نصیب ہونا وغیرہ، اس لیے وقتی کیفیت نصیب نہ ہونے سے پریشان نہیں ہونا چاہیے“۔

یہاں سے فارغ ہو کر ہم نے رات کا کھانا پھر ایک گھریلو ریسٹورنٹ میں کھایا، اس میں بھی وہی ذائقہ وہی لذت، وہی صفائی اور پاکیزگی تھی، لیکن ایک خوبصورت چیز جو اس ہوٹل کی دیکھی وہ یہ تھی کہ اس ہوٹل میں داخل ہونے کا راستہ ایک کشادہ گلی میں تھا، اور اس راستے کے اوپر لوہے کی بڑی سی جالی تھی، جس کے اوپر انگور کی بیل چل رہی تھی، انگور کے گچھے اس میں لٹک رہے تھے، گویا کہ اس ہوٹل میں داخل ہونے والا ایک خوبصورت باغ کے نیچے جاتا تھا، جو پھلوں سے لدا ہوا تھا، اور آنے والے کو نعمت خداوندی کی کثرت کے بارے میں داخلے سے پہلے ہی اطلاع دے رہا تھا۔

ہوٹل میں کھانا کھا کر ہم سمرقند شہر میں واقع امیر تیمور کے مزار کی طرف گئے، جو دور ہی سے روشن دکھائی دے رہا تھا، لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ وہ بند ہو چکا ہے، کیونکہ اس کا وقت مقرر ہے اور اس وقت مقررہ کے بعد اس کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، ساتھیوں نے باہر ہی کھڑے ہو کر اس کی تصویریں لیں اور ان کے لیے ایصال ثواب بھی کیا، یوں بن دیکھے ہم وہاں سے اپنی رہائش گاہ میجسٹک ہوٹل پہنچے۔

صبح آٹھ بجے سمرقند سے بخارا جانا تھا، جب بس میں بیٹھنے کے لیے کمرے سے نکل کر باہر آئے، تو ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی، سمرقند شہر کی خوبصورتی، اس کے لہلہاتی ٹہنیاں، اس کی سرسر کرتی ہوائیں اور ساتھ میں رم جھم رم جھم برسنے والی بارش، صبح کے وقت کا سکون، اس کے ساتھ اولیاء کے سرزمین ازبکستان کا سکون، دل کو بھا جانے والے، اور سکون مہیا کرنے کے سارے اسباب گویا اس جگہ جمع تھے، بھائی سنجار کا سنایا ہوا شعر خوب سمجھ میں آ رہا تھا، بلکہ سمرقند کا یہ حسن گویا پورے دلائل کے ساتھ ہمیں اس بات کا قائل کر رہا تھا کہ:

ع سمرقند صیقل روئے زمین است

بخارا کی طرف روانگی

اس دلربا موسم میں، اس دلکش نظارے، اس دلفریب حسن کو چھوڑ کر آج ہمیں بخارا جانا تھا، اور ہم صیقل روئے زمین سے بخارا (قوت اسلام و دین) کی طرف جارہے تھے، یہ تو معلوم نہیں تھا کہ یہ دلفریبی، یہ حسن و جمال صرف سمرقند ہی کے حصے میں آیا ہے، یا پھر بخارا بھی اس حسن و جمال میں اس کا ہم زلف ہے؟، اس لیے کچھ لمحے کے لیے اس دلکشی کو چھوڑ کر جانا گراں معلوم ہو رہا تھا، اور اس بوجھ کو اٹھائے ہم بس میں سوار ہوئے کہ بخارا جو اسلام و دین کی قوت ہے اس کا دیدار بھی پہلی بار کریں، پھر نہ جانے کب اور کس بار یہ زیارت نصیب ہو گی؟، کیونکہ بخارا کو یہاں کے عام دینی خصوصیات سے ہٹ کر ایک یہ بھی فوقیت حاصل رہی ہے کہ اس میں اولیاء اللہ بنسبت دیگر علاقوں کے زیادہ رہے، خصوصا سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگان دین کا ایک بڑا سلسلہ یہیں پر ہے، جس طرح لوگ یہاں علم دین کے سیکھنے کے لیے آتے تھے اسی طرح باطن کی صفائی کے لیے بھی لوگ اس علاقے میں جوق در جوق آیا کرتے تھے۔

علم دین کے لیے دیگر علاقوں کی طرح اس علاقے (بخارا) نے بھی بہت شہرت حاصل کی، شہرت اس قدر حاصل کی کہ اس وقت حکمرانی کرنے والے عرب کے ذہنوں میں اس وقت سے اب تک وہی نام، وہی نقش و نگار جمے ہوئے ہیں، وہ ان کے علمی فوقیت و برتری کے ساتھ ساتھ ان کے کھانوں کے بھی اب تک شیدائی ہیں، بقول ایک استاد محترم (مولانا انور بدخشانی دامت برکاتہم) کے عربوں کے ہاں کتاب بھی بخاری مقبول ہے اور کھانا بھی، چنانچہ وہ حوالہ میں "صحیح بخاری" (یعنی کتاب بخاری)، اور کھانے میں "رز بخاری" چاہتے ہیں، جس طرح ان میں صحیح بخاری کتابوں میں مقبول ہے، اسی طرح ان کے ہاں کھانوں میں "رز بخاری" مقبول ہے۔

کبھی علم حدیث کے حصول کے لیے آنے والوں کے لیے بخارا ایک ترجیحی جگہ ہوا کرتی تھی، وہ اونٹوں کا سفر کر کے اس وقت بخارا پہنچنے کی کوشش کیا کرتے تھے، مصر و حجاز، بغداد، افریقہ غرض ہر طرف کے لوگوں کا رخ بخارا کی طرف ہوا کرتا تھا، تاکہ حدیث کی بہاروں میں رہ کر وہ بھی اپنے علمی فصلوں میں خوب ترقیاں دیکھ سکیں، کوفہ کے بعد خیر القرون کے زمانے کے بعد بخارا نے وہ نام پیدا کیا کہ ایک جہاں اس سرزمین سے فیضیاب ہوا، احادیث صحیحہ کو سقیمہ سے جدا کرنے کے لیے یہ ایک بہت بڑا صرافہ بازار شمار کیا جانے لگا، جہاں کھرے

کھوٹے کو جدا جدا کر کے ایک صاف شفاف چیز امت مسلمہ کے ہاتھ میں آجایا کرتی تھی۔

تشنگان علم معرفت بھی اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے بخارا کا رخ کیا کرتے تھے، یہیں پر اللہ والوں کی صحبت سے قلبی سکون کو حاصل کرنے مضطرب دل لوگ پہنچتے تھے، جنہیں اپنے دلوں میں سکون، رب تعالی سے تعلق پیدا کرنے کی چاہ ہوا کرتی تھی، جس کے دل میں غم یار پیدا کرنے ایک تڑپ تھی، جو خود کو واقعی اس تزکیہ نفس کے ذریعے سے منور کرنے کی سوچتے تھے، تو وہ ان علاقوں کی طرف رخ کیا کرتا تھا، اس علاقے بخارا میں دل کی بیماریوں کے وہ بڑے طبیب تھے جو نہ صرف علاج امراض قلبی کو جاننے والے تھے، بلکہ قلبی امراض کے علاج میں اجتہاد کے درجے پر فائز تھے، انہوں نے دیگر اطباء روحانی سے ہٹ کر کچھ نئے اصول قلب کی صفائی کے لیے وضع کیے، جن کی طرف مستقل سلسلوں کی نسبت کی جانے لگی وہ لوگ بھی اسی سرزمین پر پیدا ہوئے اور فیض پہنچانے لگے۔

بخارا کے لیے بلٹ ٹرین سے روانگی

بخارا کی طرف جانے کے لیے ہمیں ان کی پچیس سالوں میں کی جانے والی مواصلاتی نظام کی ترقی کو بھی دیکھنا تھا، جس چیز کو پاکستان ستر سال میں نہ بنا سکا، وہ انہوں نے پچیس سال میں حاصل کر لیا، ہم اسی ترقی سے مستفید ہونے کے لیے سمرقند بلٹ ٹرین میں بخارا کی طرف سفر کرنے کے لیے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے، رستہ بھر سمرقند کی خوبصورتی، اس کے درختوں کی جھرمٹ، علاقوں کی صفائی ستھرائی کو دیکھتے رہے، درختوں کے کثرت کی وجہ سے ایسا لگتا تھا، گویا پورے شہر کو ان درختوں نے اپنی باہوں میں لیا ہو، اور اسے گھیر رکھا ہو۔

یہاں سے ہم سمرقند ریلوے اسٹیشن چلے گئے جو کسی ایئرپورٹ سے کم نہیں، بہت خوبصورتی سے بنایا گیا یہ ریلوے اسٹیشن نہ صرف بلٹ ٹرین کے لیے تھا، بلکہ یہ عام ٹرینوں کا بھی اسٹیشن ہے، یہاں بھی پاسپورٹ دکھانے پڑتے ہیں، ہم چونکہ گاڑی کے وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے، اس لیے ہمیں وہاں انتظار کرنا تھا، وہاں موجود لوگ بالکل روسی طرز زندگی گزارنے والے لگ رہے تھے، داڑھی والا ہمارے علاوہ کوئی نظر نہیں آرہا تھا، لیکن ان لوگوں کی نگاہوں میں جیسے ہم نئے تھے ویسے ہی قابل التفات بھی؛ کیونکہ اللہ والوں کی بڑی تعداد

ہمارے درمیان موجود تھی، کچھ لوگ ہمارے لباس وحلیہ کی وجہ سے تعجب کر رہے تھے، تو کچھ کا دل دعا کے لیے للچا رہا تھا، کچھ لوگ شاید گھومنے والے ہوں گے، تو ان کے لیے داڑھی وغیر داڑھی برابر تھی، وہ خود میں یا پھر اپنے موبائلوں میں مگن تھے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی دیکھے جو اپنے موبائل کو بہانہ بنا کر نظریں ہماری طرف لگائے ہوئے تھے، یہ تو علم نہیں کہ وہ عقیدت سے دیکھ رہے تھے، یا انہیں میڈیا کے غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے یہ ڈر تھا کہ ہم اب پھٹیں گے کہ تب پھٹیں گے، بہر حال بہت سارے ایسے لوگ دیکھے جو اس باحیا وباوقار مجمعے کی طرف متوجہ تھا، کچھ تو ایسے بھی نظر آئے جنہوں نے آگے بڑھ کر بعض دوستوں کے ساتھ تصویریں بھی کھچوالیں، کچھ نے بنا بتائے بنچوں کے پیچھے سے آکر ان داڑھی والے لوگوں کے ساتھ سیلفیاں لیں۔

گاڑی کا وقت ہوا تو ہم پلیٹ فارم پہنچ گئے اور وہاں پر انتظار کیا صاف ستھرے پلیٹ فارم جس پر کچرے کا نام ونشان نہیں تھا، سلیقے سے کھڑے ہوئے لوگ اور ہم، اتنے میں بلٹ ٹرین پہنچ گئی اور ہم ٹرین پر سوار ہوگئے، اپنی سیٹوں پر بیٹھے تو ہمارے سامنے دو ازبکی باشندے بیٹھ گئے، بندہ استاد محترم کے ساتھ تھا اور ازبکی باشندے پہلے تو کچھ وقت خاموش رہے، آپس میں ایک دوسرے سے تعارف کیا، ان کی بات تو سمجھ نہیں آرہی تھی، لیکن ان کے اشاروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے احوال معلوم کر رہے ہیں، کچھ دیر گزرنے کے بعد ان میں کا ایک ہماری طرف متوجہ ہوا اور بندہ سے ملک کے بارے میں پوچھا، بندہ نے پاکستان کا بتایا تو بہت خوش ہوا اور پھر اگلا سوال داغ دیا کہ ازبکی جانتے ہو؟ بندہ کا جواب نا میں پا کر اس نے فوراً فارسی کا پوچھا کہ فارسی جانتے ہو؟ بندہ نے ہاں میں سر ہلایا اور خوش بھی ہوا کہ چلو کسی ازبکی سے فارسی میں بات کر کے دعوت تو دے دیں گے، لیکن اسے تاجکوں والی فارسی آتی تھی اور بندہ کتابی جملے جوڑ توڑ کرنا تھوڑا بہت جانتا تھا، لیکن "**مالا يدرك كله لايترك كله**" کے ضابطے پر عمل کرتے ہوئے اس سے فارسی میں گفتگو شروع کر دی، جس میں اس نے سب سے پہلے استاد محترم کے بارے میں، ان کی عمر کے بارے میں پھر ہمارے مشغلے کے بارے میں سوال پہ سوال کرتا جا رہا تھا، بندہ بس اس کی بات سن ہی رہا تھا اور اپنی گلابی فارسی میں اس کا جواب دے رہا تھا، اس نے جب یہ معلوم کیا کہ تصوف یا اہل تصوف کے پاس ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہے تو بہت خوش ہوا، اور خود بھی سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق کے بارے میں بتایا، پھر وہ دینی علوم کے بارے میں کچھ معلومات جو وہ

رکھتا تھا اس کے بارے میں بتاتا رہا، خود "بی کام" کیا ہوا تھا اور اسی فیلڈ میں آگے جانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ کاروبار بھی کر رہا تھا، لیکن دینی علوم کے پڑھنے کی خواہش بھی رکھتا تھا اور کچھ مطالعہ بھی کرتا تھا۔

بندہ نے اسے استاد محترم کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے ملک میں مدفون علماء اور کیے جانے والے بعض علمی کاموں کے بارے میں بتایا، تو بندہ کو بہت خوشی محسوس ہوئی کہ ان میں سے اکثر کے بارے میں وہ پہلے سے جانتا تھا، جس سے یہ امید لاحق ہوئی کہ جس شخص کو اپنی تاریخ کا علم ہو وہ ضرور ایک دن بیدار ہو گا، مسئلہ اس قوم کے لیے ہے جسے اپنی تاریخ کا علم نہ ہو، جو اپنے بڑوں، ان کی سیرت، ان کے کارناموں سے ناواقف ہو، جس کے دن رات غیروں کی تعریف کرنے کے بجائے اپنے بڑوں کی اچھائی اور اس کی وجہ سے ہونے والی ترقی کے بارے میں کتابوں کے مطالعے میں گزرتے ہوں، اور اپنے بڑوں سے سرزد ہونے والی کوتاہیوں اور ان کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کے بارے میں ورق گردانی کرتا رہے، ایسا شخص ضرور ایک دن بیدار ہو گا اور نہ صرف بیدار ہو گا، بلکہ دوسروں کو بیدار کرنے کی کوشش بھی کرے گا، باطل چونکہ اس بات کو جانتا ہے اس لیے وہ ہمارے ملک پاکستان کے نصابی کتابوں سے اب اسی طرح بڑوں سے متعلق لکھی گئی باتوں، ان کی سیرت سے متعلق ذکر کیے گئے چند معمولی جملوں کو بھی برداشت نہیں کر سکے اور حکومت پر زور ڈال کر اس کے ختم کرنے کی پوری کوشش کرتے رہے ہیں اور اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، کیونکہ اگر پاکستانی قوم کو زیر کرنا ہے تو انہیں اپنی تاریخ بھلانی ہو گی، اس کے گزشتہ فیصلوں اور اس کے لیے دی گئی قربانیوں کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنا ہو گا، ورنہ کوئی بھی مسلمان اٹھ کر ان قربانیوں کا حوالہ دے کسی بھی قانون کو ختم کرنے سے روکے گا، اس لیے انہیں تاریخ سے دور کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے، اللہ تبارک وتعالی ہمیں اپنے بڑوں اور ان کی اچھائیوں کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے اور دشمن کی چالوں سے ہماری حفاظت فرمائیں۔

اس شخص کی تاریخ دانی اور خود اپنے بڑوں کے بارے میں معلومات رکھنے سے اسی لیے خوشی ہوئی، پھر اس کی نیک تمنائیں، اپنے بچوں کی دینی تربیت کے لیے اس کی فکر واقعی قابل رشک تھی، کہ روسی تسلط میں رہنے کے بعد آج تک ان کے دل سے وہ محبت ختم نہیں کی جاسکی جو ان کے آباؤ واجداد سے انہیں ورثے میں ملی تھی۔

ٹرین کی رفتار خوب تھی، راستے میں وہی کسانوں کا ہل چلانا، چرواہوں کا بکریاں لے جانا، دکان داروں کا سودا بیچنا، اور ہر شخص کا اپنے اپنے کام میں مصروف و مگن ہونا نظر آیا، ریل گاڑی تیز رفتاری سے چلتے چلتے ایک اسٹیشن پر رک گئی، جس میں کچھ لوگ اترے اور کچھ لوگ سوار ہوئے، جب اسٹیشن کا نام دیکھا تو ’’اسپانیہ‘‘ نام لکھا تھا، جو ’’ہسپانیہ‘‘ کے بالکل مشابھہ تھا، اس اسٹیشن پر ٹرین صرف ڈیڑھ منٹ کے لیے رکی اور پھر تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے بخارا گیارہ بج کر بیس منٹ پر پہنچی۔

اس طرح ہم قوت اسلام و دین بخارا میں داخل ہوئے، اسٹیشن سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ ہمارے استقبال کے لیے نائب گورنر جمال الدین صاحب آئے ہوئے ہیں، انہوں نے بس میں چڑھ کر استقبالیہ کلمات کہے اور حکومت وقت کی طرف سے پورے گروپ کو خوش آمدید کہا اور شکریہ ادا کیا حکومت اور مسلمانوں کے لیے دعا کی درخواست کی، اور پھر وقت کی تنگی کی معذرت کر کے چلے گئے، ہمارے ساتھ بخارا کے مفتی اعظم محمد جابر بس میں سوار ہوئے اور بخارا کے سفر میں ہمارے ساتھ شریک رہے، اور ہم انہیں کے ساتھ بخارا کے مختلف مقامات پر گئے اور ان کی وجہ سے ہمیں بہت ساری سہولیات بھی حاصل ہوئیں۔

بخارا میں تاجک لوگ بہت زیادہ ہیں، آپ کو ہر جگہ تاجکی بولنے والے بآسانی میسر ہوں گے جو تاجکی (فارسی سے ملتی جلتی زبان) میں بات کرتے ہیں، اور تاجکی کی وجہ سے فارسی جاننے والے بھی یہاں بہت ہیں، بھائی سنجار نے بھی ہمیں بتایا کہ یہاں کے لوگ فارسی زبان کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں، یہاں کے لوگ ’’دری زبان‘‘ میں بات کرتے ہیں جو افغانستان اور تاجکستان میں بولی جاتی ہے۔

بخارا میں عمارتیں پانچ چھ منزلہ تک موجود ہیں، جبکہ سمرقند میں عموماً عمارتیں چھوٹی ہیں، بخارا میں سڑک کے ساتھ ساتھ موٹے پائپ بھی چل رہے ہیں، جو شاید پانی کے پائپ ہیں، یہاں پر جو چیز دیکھنے کو ملی وہ بہت سارے مکانات کی صورت کی یکسانیت تھی، جو بالکل ایک جیسے بنائے گئے تھے، انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی ایک بلڈر نے ایک ہی ڈیزائن میں بنائے ہیں، بعد میں بھائی سنجار سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ حکومت کی طرف سے بنائے گئے مکانات ہیں جو غریبوں کو بہت سستے داموں میں آسان اقساط پر فروخت کیے جاتے ہیں، گویا یہاں ہر شخص چند سال بعد صاحب خانۂ خود ہی بن جاتا ہے، ان مکانات کی تعمیرات بھی بہت عمدہ تھی، اور ان کی صفائی ستھرائی بھی دیدنی تھی، ان حکومتی مکانات کے علاوہ تقریباً اکثر مکانات دیہاتی طرز

کے بنائے گئے تھے۔

بخارا میں بازار بنسبت دوسری جگہوں کے زیادہ نظر آئے اور لوگ بھی زیادہ تعداد میں نظر آرہے تھے، ملک کے دوسری جگہوں کی طرح بخارا میں بھی جا بجا ان کے اپنے ملک میں بنی گاڑیوں (شاورلیٹ) کی کمپنیاں نظر آرہی تھیں، جس میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی گاڑیاں تیار کی جاتی ہیں، دوسری گاڑیاں یہاں بہت کم نظر آئیں، جس کی وجہ سے ان کے ہاں باہر سے آنے والی گاڑیوں کی قدر و قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔

ہم بخارا پہنچنے کے بعد سب سے پہلے نقشبندی سلسلے کے شیخ ''خواجہ عبد الخالق غجدوانی'' رحمہ اللہ کے مزار کی طرف روانہ ہوئے جو ایک دیہات میں ہے، رستے بھر ناشپاتی کے باغات اور کپاس کی فصلیں نظر آئیں، یہاں کے کسان بھی پاکستان کے ''ھاریوں'' کی طرح بہت محنت کرنے والے ہیں، اپنے کھیتوں میں کچھ لوگ کپاس چننے میں مصروف تھے، کچھ دوسرے کاموں میں، اس طرح کے خوبصورت رستے پر چل کر ہم خواجہ عبد الخالق غجدوانی رحمہ اللہ کے مزار پہنچے، جنہیں یہاں کے لوگ ''خواجۂ جہاں'' کے نام سے بھی جانتے ہیں، بلکہ زیادہ تر اسی نام سے پکارتے ہیں۔

مزار خواجہ عبد الخالق غجدوانی رحمہ اللہ

خواجہ عبد الخالق غجدوانی کی پیدائش بخارا کے ایک بڑے شہر غجدوان میں ہوئی۔ آپ کی ولادت ۲۲ر شعبان ۴۳۵ھ / ۱۰۴۴ء کو غجدوان میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام خواجہ عبد الجلیل خواجہ عبد الجمیل تھا جن کا وصال آپ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے ہو گیا، لہذا آپ کی پرورش کا سارا اہتمام آپ کی نیک سیرت والدہ نے کیا۔ آپ نے بیعت و خلافت خواجہ ابو یوسف ہمدانی سے حاصل کی اور بخارا میں ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ آپ اپنی روش و حالات کو اغیار کی نظروں سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ آپ جب لوگوں کو تلقین فرماتے تو جذبہ و وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آپ کی تاریخ وصال پر مختلف آراء ہیں: بعض نے ۶۱۶ھ، بعض نے ۶۱۷ھ اور بعض روایات میں ۶۱۵ھ لکھا ہے۔ تذکرۃ المشائخ نقشبندیہ اور صوفیائے نقشبند نے آپ کا وصال ۱۲ر بیع الاول ۶۷۵ھ لکھا ہے۔ اس طرح

یہ آفتاب ولایت منبع علم و عرفان خواجہ عبد الخالق غجدوانی اپنے خالق حقیقی، اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔(وکی پیڈیا)۔

ان کے مزار میں بھی دیگر بہت سارے مزاروں کی طرح تعمیراتی کام ہو رہا تھا، خواجہ صاحب کی قبر کے اردگرد فی الحال کوئی عمارت نہیں تھی، اور ابھی وہی عمارت تعمیر کی جارہی تھی، ہم جیسے ہی پہنچے وہاں کام کرنے والے مزدور فوراً ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے اور ہماری طرف دیکھنے لگے، ہم دعا وغیرہ سے فارغ ہوئے تو نماز کی تیاری کے لیے چلے گئے، چونکہ کام چل رہا تھا اس لیے جگہ جگہ پر مٹی کے ڈھیر اور سریے رکھے تھے، جس کو عبور کرنا استاد محترم کے لیے مشکل تھا، اس لیے بندہ صحیح راستے سے استاد محترم کو وضو وغیرہ بنانے لے گیا، واپسی میں جب مسجد کی طرف آنے لگے تو ایک شخص نے استاد محترم کو دیکھ کر تبرکاً ہاتھ پکڑا اور مسجد کی طرف ساتھ چلنے لگا، وہ وہاں کام کرنے والا کوئی مزدور تھا، جو استاد جی کو دیکھ کر آیا تھا۔

راستے میں اس نے بھی وہی سوال کیا کہ ازبکی جانتے ہو؟ پھر فارسی کے بارے میں پوچھا اور فارسی کے لیے ہاں کرنے کی صورت میں خوشی کا اظہار کیا اور فارسی میں گفتگو شروع کر دی، اسے بھی ہمارے پاکستانی ہونے پر خوشی تھی، وہ ہمارے پاکستانی ہونے سے بہت خوش تھا اور پاکستان کی تعریف کرنے میں مصروف تھا، اور افغانستان سے لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا، یوں بات کرتے کرتے ہم مسجد پہنچے جہاں ظہر کی نماز تیار تھی، ہم نماز میں شریک ہوگئے اور نماز کے بعد مسجد کے امام صاحب "مولانا جلال الدین" صاحب نے تلاوت و دعا کروائی، اس کے بعد قاری عبد الرحمان رحیمی صاحب نے تلاوت کی اور تلاوت کے بعد مفتی طاہر مسعود صاحب نے دعا کروائی، دعا کے بعد مجمع ان حضرات سے ملنے کے لیے ٹوٹ پڑا، یہ سب لوگ پینٹ پتلون میں ملبوس تھے، لیکن ان میں سے اکثر کی داڑھیاں موجود تھیں، اور سروں پر عمامے سجائے ہوئے تھے، کچھ نے صوفیوں کی ٹوپی پہن رکھی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں خانقاہ کے سالکین ہیں، شاید یہ ہمارا گمان ہو؛ کیونکہ قریب کے اکثر لوگ ان بزرگوں سے متاثر تھے، لہٰذا اہل محلہ اس لباس میں ہوں یہ بھی عین ممکن تھا، استاد محترم کو دیکھ کر بہت سے سفید ریش بھی دوڑے چلے آئے اور اشارہ سے دعا کی درخواست کرتے رہے، استاد محترم نے بھی خوب دعائیں دیں اور یوں ہم آہستہ آہستہ اس مسجد سے باہر نکلے، جب مزار کے احاطے سے باہر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پورا گروپ ہم چند حضرات کا انتظار کر رہا تھا، پروٹوکول کی گاڑی بھی انتظار میں تھی ہمیں چونکہ اس کی خبر

نہ تھی اس لیے دیر ہو گئی۔

مزار سے فراغت کے بعد ہم قریبی ایک ”گھریلو ریسٹورنٹ“ میں چلے گئے جس میں بہت خوبصورتی سے بنے برتن اور اس کے علاوہ، کھیت اور پھل وغیرہ بھی تھے اور انہوں نے بھی ہمیں عمدہ کھانا کھلایا، یہاں دستر خوان پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک ساتھی نے دستر خوان پر ازبکستان کی تعریفیں شروع کر دیں اور ساتھ میں پاکستان سے تقابل بھی، ہم سنتے رہے اور کچھ کہا نہیں، استاد محترم نے نہ جانے کونسے جملے کو نوٹ کیا اور خوب غصہ ہوئے، جس پر وہ ساتھی بھی پریشان ہو گئے، لیکن استاد جی نے پاکستان سے تقابل میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ان کے پاس موجود زمینی رقبہ، ان کی کم آبادی، اور پاکستان کی آبادی کی کثرت اور زمینی رقبہ کی کمی، پاکستان میں موجود ٹیلنٹ کا خوب تذکرہ کیا، اور پھر فرمایا کہ خوبیاں اپنی جگہ اپنے ملک کی برائی کرنے سے کیا حاصل، بس دوسروں کی خوبیوں کو نوٹ کر کے اس کا تذکرہ کرو، اپنے ملک کی برائی کیوں بیان کرتے ہو، خیر کسی طرح مجلس برخاست ہوئی تو اس ساتھی کی بخشش ہوئی ورنہ تو آج ان کی خیر نہیں تھی۔

جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا یہ جگہ درحقیقت ہوٹل نہیں تھا، بلکہ سید امیر کلال رحمہ اللہ کے اولاد کی جگہ تھی، یہ یہاں پر برتن بنایا کرتے تھے، لوگ جب ان علاقوں میں آتے تو ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے برتن خریدتے، ان کی ہنر مندی دیکھنے کے لیے ان کے ہاں جاتے، یہ برتنوں والا پیشہ ان کا بہت پرانا ہے، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے امیر کلال رحمہ اللہ کو بھی ”کلال“ (مٹی کے پیالے، برتن بنانے والا) کہا جاتا تھا، جب لوگ ان حضرات کے ہاں آتے تو یہ حضرات ان کا اکرام کرتے تھے، جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ خدمت سے تجارت میں بدل گیا اور اب یہ برتن بنانے کے ساتھ ریسٹورنٹ بھی چلاتے ہیں، جہاں لوگ بہت شوق سے کھانے کھانے آتے ہیں اور مٹی کے برتن خرید کر اپنے ساتھ لے بھی جاتے ہیں، لیکن ساتھ میں وہ چیز جو تجارت نہیں بنا کرتی ہے وہ ان کی فطری محبت واخلاق ہیں جو انہیں اپنے آباء سے وراثت میں ملی ہے، وہ اخلاقیات ان میں آج بھی موجود ہیں۔

خواجہ محمود انجیر فغنوی رحمہ اللہ

کھانے سے فراغت کے بعد ہم سب خواجہ محمود انجیر فغنوی رحمہ اللہ کے مزار پر حاضر ہوئے، حضرت خواجہ محمود فغنوی رحمہ اللہ حضرت عارف ریگوری رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے جو کہ خواجہ عبد الخالق غجدوانی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے، اور سلسلہ نقشبند کے اکابر صوفیا میں سے تھے، یہ مزار انجیر بابا نامی گاؤں میں ہے، یہاں پہنچ کر بھی دعا کی اور آئے ہوئے لوگوں سے ملاقاتیں کیں، مدرسہ میر عرب کے دو طالب علم ہمارے ساتھ تھے، بہت عاجز مزاج اور ملنسار طلبہ تھے، ایک کا نام عثمان تھا اور دوسرے کا نام اسماعیل تھا، یہ دونوں درجہ ثانیہ کے طالب علم تھے، اور عربی زبان میں گفتگو کر سکتے تھے، اردو کے شوقین تھے، لیکن بقول اسماعیل: "آپ حضرات سے ملنے کے بعد اردو سیکھنے کی خواہش اور بھی زیادہ ہو گئی"، بس میں پہلے عثمان نے "سورہ مجادلہ" کے آخری رکوع کی تلاوت کی اس کے بعد ساتھیوں کے مطالبے پر ازبکی زبان میں اشعار سنائے جو اگرچہ ہمیں سمجھ نہیں آرہے تھے، لیکن اس کے کچھ الفاظ چونکہ فارسی کے موافق تھے تو اسی قدر سمجھ میں آجاتے تھے اس نے ازبکی ترانہ نما اشعار جس کا پہلا لفظ تھا "ازبکی ام"، یہ اشعار سنائے، اس کے بعد اسماعیل کھڑا ہوا اور: «**قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ**»، والی آیات کی تلاوت کی، اس کے ساتھ اپنے مدرسے "مدرسہ میر عرب" کا مختصر تعارف کروایا، اس کے ساتھ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور سیدنا امام شافعی رحمہ اللہ کے اشعار سنائے۔

مسجد بالا حوض

بالا حوض مسجد بخارا، ازبکستان میں ایک تاریخی مسجد ہے، ضلع ریگستان میں ارگ قلعے کے مخالف سمت میں، سنہ ۱۷۱۲ میں تعمیر کی گئی تھی، یہ تاریخی شہر کے دیگر حصوں کے ساتھ ساتھ، یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثہ سائٹ کی فہرست میں بھی درج ہے۔ یہ اس وقت جمعہ کی مسجد کے طور پر کام کرتی تھی جب بخارا کے امیر کو سن ۱۹۲۰ کی دہائی میں بالشویک روسی حکمرانی کے تحت محکوم کیا جا رہا تھا۔ پینٹڈ لکڑیوں سے بنے پتلے کالموں کو ۱۹۱۷ میں ایوان (داخلی دروازے) کے اگلے حصے میں شامل کیا گیا، اس کے علاوہ گرمیوں کے نماز کے کمرے

کی چھت کی بھی بنائی گئی۔ کالموں کو رنگین مقرنوں سے سجایا گیا ہے۔

عصر کی نماز اسی مسجد "بالائے حوض" میں پڑھی جو بہت ہی خوبصورت مسجد تھی، اس کے بارے میں سنا کہ یہ مسجد کسی زمانے میں مجوسیوں کے پاس تھی، حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے لے کر مسلمانوں کے حوالے کی اور اس وقت سے اب تک یہ مسجد قائم ہے، لیکن اس بات کی کوئی سند مل نہیں سکی ہے، شاید کہیں موجود ہو۔

چاہ ایوب علیہ السلام

عصر کی نماز سے فراغت پا کر ہم چشمہ ایوب علیہ السلام نامی جگہ گئے، یہاں ازبک لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کسی زمانے میں یہاں سے گزرے تھے تو انہوں نے اپنے لشکر کے لیے یہ کنواں بنوایا تھا، اور وہ اب تک باقی ہے، اس قصے کی تاریخی حیثیت اب تک معلوم نہیں، یہ کنواں ایوب بھی یہاں کی ایک سیاحتی جگہ میں موجود ہے۔

امام بخاری کمپلیکس

اس کنویں کے ارد گرد مزید بھی کچھ جگہیں بنادی گئی ہیں، مثلا اسی کے ساتھ یہاں کی گورنمنٹ نے "امام بخاری کمپلیکس" بنایا ہے، جس میں امام بخاری رحمہ اللہ سے متعلقہ مختلف چیزیں بنا رکھی ہیں، مثلا: ان کے سفر کا نقشہ، ان کی طرف منسوب کچھ چیزیں، بخاری شریف یا دیگر شروحات کے قلمی نسخے وغیرہ اس میوزیم نما جگہ میں موجود تھے، بھائی سنجار کے بقول یہاں امام بخاری رحمہ اللہ سے متعلق کچھ نہیں تھا اس لیے یہ کمپلیکس بنا کر ان کی یاد تازہ کر دی گئی ہے، تاکہ اس زمانے میں امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا کچھ تدارک ہو کہ حاکم بخارا نے اس وقت انہیں اپنے ہی علاقے بخارا میں رہنے نہیں دیا، آج وہی حکومت ان کے نام پر فخر کرتی ہے اور ان کا نام لے کر جی رہی ہے، اس لیے ان سے متعلق کوئی یادگار ضروری تھی، سو انہوں نے یہ میوزیم نما بنا کر امام بخاری رحمہ اللہ کی یادگار کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اسی احاطے میں کچھ بادشاہوں کی قبریں بھی تھی، جو بہت پرانی معلوم ہوتی تھیں، ان کے بارے میں حتمی کوئی بات تو ذہن میں نہیں، البتہ کچھ بہادر قسم کے بادشاہوں میں سے تھے، جن کی بہادری یہاں کے لوگوں میں مشہور ہے، اور لوگ بہادری میں اس کی مثالیں دیتے ہیں، اسی احاطے سے واپس ہوتے ہوئے استاد محترم نے محمد اسماعیل (جو کہ مدرسہ میر عرب کا طالب علم تھا، اور وہاں کے مدرسہ عالیہ میں پڑھ رہا تھا، گروپ کے ساتھ رہے، خصوصا استاد محترم کے ساتھ، ان کی عاجز مزاجی جو ہمیں پورے ملک ہی میں نظر آئی، ان طلبہ میں مبالغہ کے ساتھ پائی جارہی تھی، انہوں نے استاد محترم سے اجازت حدیث چاہی تو استاد محترم نے ان) کو اجازت حدیث دی، یہ طالب علم ترمذی وغیرہ بعض کتب حدیث پڑھ چکا تھا، عقائد کی کتابیں پڑھ چکا تھا اور مزید پڑھ بھی رہا تھا۔

مدرسہ میر عرب

اس کے بعد ہم مدرسہ میر عرب کی طرف گئے، میر عرب مدرسہ کی تعمیر کا سہرا یمن کے شیخ عبد اللہ یمنی کو جاتا ہے۔ اسے میر عرب بھی کہا جاتا ہے، وہ عبید اللہ خان اور ان کے بیٹے عبد العزیز خان کے روحانی سرپرست سمجھے جاتے تھے۔ عبید اللہ خان نے ایران کے خلاف کامیاب جنگ لڑی کم از کم تین بار اس کی فوج نے ہرات پر قبضہ کرلیا، عبید اللہ خان نے تین ہزار فارسی اسیروں کو بیچنے سے جو رقم حاصل کی تھی اس سے میر عرب مدرسہ کی تعمیر کے لیے مالی اعانت فراہم کی تھی، عبید اللہ خان بہت مذہبی تھے، ان کے والد نے ان کا نام ۱۵ویں صدی کے ممتاز شیخ عبید اللہ الاحرار (۱۴۰۴-۱۴۹۰) کے اعزاز میں رکھا تھا، اس کا تعلق تاشقند سے تھا۔ (وکی پیڈیا)

ہم مغرب کے قریب مدرسہ پہنچے، جہاں ایک قدیم مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانا تھا، چنانچہ ہم پہلے مغرب کی نماز کے لیے وہیں موجود ایک مسجد میں گئے، مسجد بڑی تھی، قدیم طرز کی بنی ہوئی اور احاطہ بھی بڑا تھا، وضو خانہ کافی باہر تھا، استاد محترم کے ساتھ بندہ بھی وضو کے لیے چلا گیا تھا، وضو خانہ میں تعمیراتی کام بھی جاری تھا، اور بجلی کا نظام بھی اس وقت معطل تھا، جس کی وجہ سے ہمیں تاخیر ہوگئی، گروپ کے دیگر ساتھیوں نے نماز

مغرب پڑھ لی تھی اور مدرسہ میر عرب جاچکے تھے، ہم بھی وضو وغیرہ بناکر مدرسہ میر عرب ہی چلے گئے اور نماز مغرب پڑھنے کا ارادہ کیا، طلبہ کا ایک جم غفیر ہمارے ساتھ ہولیا اور مدرسہ کے اندر موجود مسجد میں ایک کرسی پر استاد محترم کو بٹھاکر طلبہ نے گھیر لیا، طلبہ نے استاد محترم کو تولیہ لے کر منہ ہاتھ خود پونچے اور پھر اپنے لائے ہوئے موزے استاد محترم کو پہنائے، اور نماز کے لیے مصلی درست کیا، اور انتظار میں بیٹھ گئے کہ کب استاد محترم کی نماز ختم ہو اور یہ طلبہ پھر لپکیں، استاد جی کی نماز ختم ہوتے ہی یہ طلبہ فورا آگے بڑھے اور دعا کی درخواست کی، استاد محترم نے خوب رو رو کر دعائیں دیں اور پھر وہاں موجود بادشاہ کی قبر پر دعا وفاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوئے۔

جب واپسی کے لیے باہر نکلنے لگے تو طلبہ نے پھر سے لجاجت کے ساتھ استاد محترم کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے کی درخواست کی، بندہ نے شرمندہ ہوکر انہیں کو ہاتھ تھما دیا، اور ساتھ ساتھ چلتا رہا، ان طلبہ کو چونکہ استاد محترم کی راحت کا اندازہ نہیں تھا اس لیے بندہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا کہ تا کہ کوئی تکلیف نہ ہو۔

مدرسہ میر عرب کو بھی بہت خوبصورت انداز سے بنایا گیا تھا، مضبوط دیواریں، کشادہ صحن اور بڑا سا ہال اس مسجد کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا، اس میں ۱۱۴ کمرے ہیں، جن میں تعلیم تو اگرچہ اب بھی ہوتی ہے، لیکن زیادہ تر اس میں سیاح گھومنے جاتے ہیں، جن کے لیے اس کے قریب میں کافی دکانیں ہیں، بلکہ پورا ایک بازار ہے جو کسی زمانے میں عالمی شہرت یافتہ مارکیٹ ہوا کرتی تھی، جس کے کچھ آثار اب بھی موجود ہیں۔

طلبہ کا خلوص دیدنی تھا، وہ ہر لمحہ استاد محترم کو دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے آگے بڑھنے میں اس کا لحاظ رکھ رہے تھے، اور آگے اسی انداز سے بڑھ رہے تھے، اور استاد محترم سے مختلف نوعیت کے سوالات کر رہے تھے، استاد محترم انہیں جواب دیتے جارہے تھے، خصوصا مدرسہ میر عرب میں صاحب ہدایہ کے گاؤں کا ایک طالب علم جن کا گھر صاحب ہدایا کے گاؤں سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا، وہ بہت ہی عجیب قسم کا ''بکاء'' (بہت رونے والا) تھا، نماز پڑھنے کے بعد سے مدرسہ میر عرب اور مدرسہ میر عرب کے بعد سے ہوٹل تک یہ طالب علم ساتھ رہا اور مستقل اس کے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، نام اس کا فضل الدین تھا، اور فرغانہ کا رہنے والا مرغینانی طالب علم تھا، اور وہاں کے ماحول کے لحاظ سے وہ جیسا بھی ہو، لیکن ایک عجیب بات اس کی یہ دیکھی کہ جب ہم بس میں سوار ہونے کے لیے آئے تو یہ بس تک ساتھ ہی آتا رہا، جب بس میں استاد محترم کو بٹھا دیا تو یہ

بس کے قریب ہو گیا، ہمارے ساتھی بھی اس سے بات چیت میں مصروف ہو گئے، ایک ساتھی نے اس سے تصویر بنوانے کی اجازت چاہی، اس نے فوراً منع کر دیا، اور کہا کہ میں تصویریں نہیں بنواتا ہوں، جس ساتھی نے درخواست کی تھی وہ کہنے لگے مجھے بہت سبکی ہوئی جب اس طالب علم نے تصویر بنوانے سے منع کر دیا، میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں کہ اس ماحول میں بھی اس نے خود کو ان چیزوں سے بچائے رکھا ہے۔

مسجد کلاں

اس مدرسہ میر عرب کے سامنے مسجد کلاں ہے، بہت عجیب پر کیف جگہ تھی "بخارا کی زمین" یہ مدرسہ اور اس سے متصل جتنی جگہ تھی سب قدیم بخارا کہلاتا ہے، جہاں پر مدرسہ میر عرب، مسجد کلاں ہے، اس علاقے میں اب اپنا ذاتی مکان بھی توڑا نہیں جاسکتا ورنہ گورنمنٹ اس کی ملکیت ختم کر کے اپنے ثقافتی ورثہ کے طور پر محفوظ کر لیتی ہے۔

مدرسہ میر عرب سے فارغ ہو کر ہم وہیں قریب میں موجود ایک ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے تھے، کھانے میں ہم نے پھر طرح طرح کے لذیذ کھانے کھائے اور شکر ادا کر کے اپنی رہائش گاہ کی طرف چل دیئے، بخارا کے قدیم حصے میں، چونکہ زیادہ اونچی عمارتیں نہ بناتے ہیں نہ بنا سکتے ہیں، اس لیے رہائش کے لیے یہیں پر موجود عمارتوں کو ڈیکوریٹ کر کے ہوٹلنگ کے لیے تیار کیا جاتا ہے، ہمارا ہوٹل بھی اسی طرح ایک چھوٹی عمارت تھی جس میں ہم رہ رہے تھے، اور جگہ کی تنگی اور افراد کی کثرت کی وجہ سے دو ہوٹلوں میں ہماری رہائش رکھی گئی، بعض شرکاء سفر کو پرانے بخارا کے ہوٹل میں جو کہ مدرسہ میر عرب کے بالکل ساتھ جگہ دی گئی اور بعض کو بخارا شہر میں کسی ہوٹل میں رہائش دی گئی، ہمیں ابتداء شہر بخارا میں رہائش دی گئی، لیکن مولانا طلحہ رحمانی صاحب کے کہنے کی وجہ سے ہماری رہائش بدل کر پرانے شہر ہی میں رکھی گئی، یہ رہائش بالکل مدرسہ میر عرب کے پاس ہی تھی، رات کے وقت میں مسجد کلاں کے خوبصورت مینار جو کہ بہت شہرت کے حامل تھے، بالکل ہمارے سامنے تھے۔

ہوٹل میں ہمیں پہلی منزل ہی پر رہائش دی گئی، یہاں رہائشی کمرے تقسیم ہونے میں ذرا زیادہ دشواری

پیش آئی، چونکہ جماعت کو دو حصوں میں تقسیم ہونا تھا، اس لیے قریب کی جگہ چھوڑ کر دور جانا تھوڑا بوجھل ضرور تھا، لیکن الحمد للہ کہ وہ مرحلہ طے ہوا اور ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، ہوٹل کے لاؤنج میں خوبصورت ٹیبل پر بڑے سے کانچ کے برتن میں ٹوفیاں رکھیں تھیں، جسے لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے کھانے کا مزہ الگ تھا، جو ٹوفیوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس جگہ پر بیٹھنے کی وجہ سے تھا۔

عشاء کی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم تینوں باہر ٹہلنے کے لیے نکلے، باہر کا پورا علاقہ قدیم بخارا کا بازار تھا، جس کے پاس ہی یہ مسجد (کلاں) اور مدرسہ میر عرب قدیم بھی تھا، بخارا کا یہ بازار بہت قدیم اور بہت بڑی منڈی شمار کی جاتی تھی، ہم نے کچھ دیر اس بازار میں گھومنے کا ارادہ کیا، دکانیں بند تھیں، اکا دکا دکانیں ہی کھلی نظر آئیں، ورنہ تقریبا پوری مارکیٹ ہی بند تھی، جو دکانیں کھلی بھی تھیں تو وہ زیادہ تر ٹھنڈ کے لباس سے متعلقہ دکانیں تھیں، کسی زمانے میں یہاں کے بازار میں پانچ طاق ہوا کرتے تھے جو مختلف چیزوں کی مارکیٹیں تھیں، اب یہ عمومی قسم کا بازار ہے جس میں اس قدیم طرز پر الگ الگ طاق تو نہیں، لیکن وہ طاق کی جگہیں اب تک موجود ہیں۔

یہاں کے پانچ طاقوں میں سے دو روسی زمانے میں مسمار کر دیئے گئے، باقی تین اب بھی اسی حالت میں موجود ہیں، جو موجود ہیں وہ درج ذیل ہیں: ۱۔ طاق تلپک فروشاں ۲۔ طاق زرگراں ۳۔ طاق صرافاں ہے، اس کے بعد ایک اور عمارت اسی جگہ بنائی گئی ہے جو اوتم عبد اللہ کے نام سے ہے۔

جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو ہمیں دو طالب علم نظر آئے ایک کا نام محمد اور دوسرے کا نام نور محمد تھا، یہ ساری تفصیلات ہمیں انہوں نے ہی بتائی، یہ طلبہ بہت اچھی عربی بولتے تھے اور پاکستان اور وہاں کے علماء سے بہت محبت کرتے تھے، ان طلبہ سے ہم نے مختلف باتیں پوچھیں اور انہوں نے ہمیں اس کا جواب دیا، مثلا: یہاں کا نصاب تعلیم کیا ہے؟ طلبہ کی محنت، ان کے رات کو تکرار و مطالعہ کی ترتیب وغیرہ یہ طلبہ بڑے اہتمام سے بتاتے رہے اور پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کرتے رہے۔

یہاں ہمیں نوجوانوں کے کہیں ٹولے نظر نہیں آرہے تھے، ہم نے ان طلبہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ جلدی سو جاتے ہیں، ہمیں شک ہوا شاید موبائل وغیرہ کی ابتلاء عام کے بعد یہ حال ہوا ہو، انہوں نے بتایا کہ یہ یہاں کے لوگوں کا موبائل سے پہلے کا معمول ہے وہ جلدی سو جاتے ہیں اور صبح جلدی اٹھتے ہیں،

البتہ طلبہ دیر تک مطالعہ و تکرار میں مصروف رہتے ہیں۔

یہ طلبہ ہمیں بخارا کے اس بازار کی مختلف چیزیں دکھاتے رہے، اور ان عمارتوں کے بارے میں بتاتے رہے، ان طلبہ کی باتیں پھر بخارا سمرقند میں آنے والے علماء محدثین، فقہاء مجتہدین کے بارے میں سوچ کر اک عجب سی کیفیت طاری تھی، کہ اے پروردگار آپ اپنی دین کے لیے کسی کے محتاج نہیں، کوئی اپنی قربانی پیش کرے تو آپ قدر کرتے ہیں، جو آپ کے دین کے بارے میں تھوڑی ذرا سی بے پرواہی دکھائے آپ اس سے خدمت کی توفیق چھین لیتے ہیں، وہ کچھ عرصہ تو اپنے بڑوں کے اعمال کی وجہ سے چل پاتے ہیں، لیکن جب پانی سر سے گزر جائے اور ان کے پاس پھر کچھ اور بھی نہ رہے تب وہ قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں، جسے تاریخ کے طلبہ صرف کتابوں میں دیکھ پڑھ سکتے ہیں باقی کوئی حیثیت نہیں رہتی، پھر ہر شخص کا جرم اور بے رخی مختلف نوعیت کی ہوتی ہے، جس کے حساب سے انہیں سزا املا کرتی ہے، کچھ کا تذکرہ مل جاتا ہے اور کچھ کا تذکرہ تک کرنا خدائے عزوجل کو برداشت نہیں ہوتا، لہذا انہیں تاریخ کے اوراق سے بھی غائب کر کے کہہ دیتے ہیں کہ کتنی امتیں ایسی ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کیا اور تمہیں اس کے بارے میں علم بھی نہیں ہے"۔

اس لیے عقل مند و ہوشیار وہ ہے جو ان تاریخ میں موجود اپنے آباء کے بارے میں پڑھتا رہے تاکہ اور کچھ نہ ہو کم از کم وہ اپنے بڑوں کے بارے میں پڑھ کر سینہ کے داغوں کو تازہ تو رکھ سکے گا، جس کی وجہ سے ایک نا ایک دن اس کے مسائل حل اور گتھی ضرور سلجھ جائے گی۔ اسی لیے شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ع تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را گاہ گاہ باز خواں ایں قصہ پارینہ را

ہمارے ہوٹل کے بالکل پاس والی دیوار مدرسہ میر عرب قدیم کی عمارت تھی، اسی عمارت کے ساتھ مسجد کلاں، اس کے ساتھ ان طلبہ نے ہمیں اس کی پرانی گلیوں میں گھمایا اور ایک جگہ ہمیں پہنچایا، جہاں ایک مسجد بنی تھی ان کے بقول یہ وہ جگہ ہے جہاں امام بخاری رحمہ اللہ کی ولادت ہوئی بعد میں ایک بادشاہ نے اس جگہ مسجد زین الدین بنادی ہے، جس کے اندر ایک حوض ہے وہی حوض امام بخاری رحمہ اللہ کا گھر تھا، تاکہ تا قیام قیامت اسے مسمار نہ کیا جاسکے اور امام بخاری رحمہ اللہ کی جائے ولادت اسی طرح محترم و مکرم رہے۔

یہیں پر ایک مدرسہ تھا جسے بخارا کے حاکم "عالم خان" نے بنایا تھا وہ بھی یہاں موجود تھا، روسی دور میں اسے بند کر دیا گیا تھا، اب حکومت نے یہ مدرسہ "مدرسہ میر عرب" کے حوالہ کر دیا ہے وہ اس میں مدرسہ بنائیں

گے، جو مدرسہ میر عرب ہی کے تابع ہو گا۔

بخارا کی ان قدیم گلیوں میں ایسی اپنائیت تھی جیسا ان گلیوں سے ہمارا واسطہ بہت پہلے کا ہو، یہ گلیاں پہلی بار نہیں بلکہ بار بار ہم نے دیکھی ہوں، ان کے ارد گرد ہم نے چکر لگائے ہوئے، اس کے درودیوار سے ہماری پرانی شناسائی ہو، اس کے اتار چڑھاؤ، اس کے نشیب و فراز سے ہم واقف ہوں، یہ گلیاں پہلی بار دیکھ کر بھی اجنبی نہیں لگ رہی تھیں، ان کی سادگی سے کی گئی بناوٹ، ان کے عظیم الشان تاریخ کے ساتھ جڑی ہوئی ان گنت واقعات، ان درودیوار کی عظمت کو ہمارے دلوں میں مزید بڑھا رہے تھے، کبھی تاریخ کا تصور ذہن میں لاتے تو یکایک امام بخاری رحمہ اللہ کے سنت سے بھرے پیارے انداز سے چلنا سامنے آتا، کبھی امام ترمذی رحمہ اللہ کی تواضع والی کیفیت سے اپنے استاد امام بخاری رحمہ اللہ سے سوالات کرتے کرتے مدرسہ و مسجد کی طرف جانے کا منظر سکرین پر چلتا دکھائی دیتا، کبھی امام بخاری رحمہ اللہ کے درس میں شرکت کرنے کے لیے ان کے شاگرد فربری ہاتھ میں قلم و دوات لیے مسجد کی طرف دوڑتے نظر آتے، کبھی امام بخاری رحمہ اللہ کے دیگر شاگرد اپنے ہاتھوں میں قلم و دوات لیے ان گلیوں سے گزرے ہوں گے، کچھ تو تھا ان گلیوں میں جو ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا، کوئی تو راز تھا جو ہم سے چھپ کر بھی ہمیں مسحور کئے ہوئے تھا، کچھ تو ایسی چیزیں تھیں جو نظروں سے اوجھل ہو کر بھی جسم کو بوجھل کیے ہوئے تھی، جس کی کشش بلند و بالا عمارتوں سے بہت جداگانہ تھی، جو اپنی سادگی میں متانت لیے اپنی بوسیدگی میں جاودانی لیے ہوئے تھی، جو وقت کے معمار کی معماری سے تو بے نیاز تھی، لیکن ملاحت و دلفروزی میں لاجواب تھی، جس کے گلی کوچوں سے ابھرنے والی قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں آج بھی انسان کو سنائی دے سکتی ہیں، لیکن اسے چشم تصور میں لانے کے لیے باطن کا پاک ہونا ضروری ہے، قلب کا مجلی ہونا ضروری ہے جو کم از کم مجھ ناکارہ کے پاس تو نہیں تھا، اس لیے دو چار خیالات جو قلب پر وارد ہوئے وہی لکھ دیئے باقی کی کیفیات یقیناً میرے ساتھیوں نے محسوس کیے ہوں گے جنہیں میں بیان نہیں کر سکتا۔

اور ان سب پر مستزاد ان دو شریف طلبہ کی میٹھی میٹھی باتیں، ان کا عاجزی سے چلنا، ان کا مڑ مڑ کر ہماری باتوں کا جواب دینا بہت اچھا لگ رہا تھا، ان کے یہ آداب ان کے جسم میں محدثین و فقہاء کے خون کی موجودگی کی غمازی کر رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہم امام بخاری و ترمذی صاحب ہدایہ و ماتریدی کے کسی

بھانجے بھتیجے کے ساتھ گھوم رہے ہوں اور وہ ہمیں اپنے ماموں تایا کے بارے میں بتارہا ہو، ان کی میٹھی آداب سے بھری باتیں سننے کے ساتھ ساتھ ہم بازار بخارا میں گھومتے رہے اور وہ طلبہ ہمیں معلومات دیتے رہے، اچانک ہمارے پاس سے دو پولیس والے گزرے ہم نے غالبا انہیں سلام بھی کیا، اور شاید انہوں نے جواب بھی دیا تھا، لیکن ان کے گزرنے کے بعد ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ طلبہ کچھ پریشان ہو گئے، ہم نے اس بات کو فورا بھانپ لیا؛ کیوں کہ یہ ملک ابھی رشیا کے تسلط سے آزاد ہوا ہے، جو اسے اسلام کے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتا تھا اور روس کا تسلط ختم ہونے کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کسی مولوی کے ساتھ طلبہ کا پھرنا فی الحال ان لوگوں کے لیے شکوک وشبہات ہی کا باعث بنتا، اس لیے ہمیں یہی فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ان کے لیے مسئلہ نہ بن جائے سو ہم نے ان طلبہ سے پوچھ لیا کہ آپ کے لیے کوئی مسئلہ تو نہیں بنے گا، ہمارے ساتھ گھومنے کی وجہ سے، تو انہوں نے کہا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے، تب ہم نے انہیں فورا اپنے مدرسہ "میر عرب" لوٹ جانے کو کہا اور خود بھی ہوٹل کی طرف چلے گئے۔

بخارا کا موسم ٹھنڈا تھا، موبائل کے مطابق درجہ حرارت صفر تھا، لیکن بخارا کی گلیوں میں گھومتے ہوئے، اور ساتھ میں امام بخاری رحمہ اللہ کے علاقے میں ان کے بارے میں سننا اور پھر ان کے علاقوں کے طلبہ کے اخلاقیات اور شہر بخارا کا سکون سب کچھ ایسی چیزیں جمع ہو گئی تھیں کہ ہمیں سردی کا زیادہ احساس نہ ہو پایا؛ کیونکہ ان بزرگوں اور ان کے کارناموں نے جسم میں ایسی حرارت پیدا کر دی تھی کہ جس کی وجہ سے ظاہری برودت کا پتہ نہیں چل رہا تھا، لیکن اب تو ان طلبہ کی رفاقت بھی نہ رہی اور ان کے علاوہ فی الحال کوئی بتانے والا بھی نہیں تھا، سب ساکت وصامت تھے اس لیے ہم نے بھی غنیمت اسی کو سمجھا کہ جا کر سو لیا جائے، اس لئے کہ صبح بخارا کی کچھ مزید جگہیں دیکھنا باقی تھیں، سو ہم صبح کے انتظار میں سو گئے، اور اگلے دن شہر بخارا کے مزید قیمتی در نایاب کو دیکھنے کا انتظار کرتے رہے۔

خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمہ اللہ

ہم صبح: ۹:۴۴ پر ہوٹل سے روانہ ہوئے، اور مدرسہ میر عرب عالیہ میں حاضری دی، جہاں مجدد سلسلہ

نقشبندیہ، بہت سارے اسباق سلسلہ نقشبندیہ کے موجد حضرت خواجہ خواجگان، خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمہ اللہ کا مزار پر انوار ہے۔

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمہ اللہ کا نام گرامی محمد بن محمد، لقب: بہاؤالدین تھا، آپ کو خواجہ خواجگان بھی کہا جاتا ہے، آپ کی ولادت محرم الحرام ۷۲۸ھ کو قصر عارفاں نامی علاقہ میں ہوئی، جس کا پہلا نام قصر ہندواں تھا، حضرت سید بابا سماسی رحمہ اللہ نے بچپن ہی میں خصوصی توجہ فرمائی اور پھر تربیت کے لیے سید امیر کلال رحمہ اللہ کو سونپا۔

اس مزار کے لیے بھی حکومت نے بہت عمدہ احاطہ بنا رکھا ہے، جس طرح سے خواجۂ جہاں خواجہ عبد الخالق غجدوانی رحمہ اللہ کے مزار پر عامۃ الناس کا تانتا بندھا ہوا تھا، اسی طرح خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمہ اللہ کے مزار پر بھی عوام الناس کی کثرت تھی، لوگ جوق در جوق کسب فیض کے لیے حاضر ہو رہے تھے، مزار میں حاضری ہوئی، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قلب حضرت خواجہ صاحب کے اللہ اللہ کرنے کی وجہ سے بلیوں اچھل رہا ہو، اور دل میں اللہ جل جلالہ عم نوالہ کے علاوہ کچھ سماتا ہی نہ ہو، اور دل سے گناہوں کے زنگ ظلمات کدورات خطرات سب کو جلا دیتا ہو اور دل خوب دھڑک دھڑک کر قلب پر ضربیں لگا رہا ہو اور کہہ رہا ہو "اللہ اللہ اللہ اللہ"۔

ابھی خواجہ صاحب کے مزار سے سیرابی ہوئی بھی نہ تھی کہ ہمیں وہاں سے مدرسہ میر عرب عالیہ جو بالکل اسی احاطہ میں بنا ہوا تھا وہاں بھی جانا تھا، ہم خواجہ صاحب کے مزار پر حکومتی اقدامات، عوامی معاملات کو دیکھتے ہوئے مدرسہ میر عرب کی طرف روانہ ہوئے، اس مزار پر بھی ہم نے دیکھا کہ بنچیں بچھائی ہوئی تھیں اور لوگ آکر یہاں بیٹھ کر دعا کرتے، تلاوت کرتے اور چلے جاتے، یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ کے مزار کے ارد گرد بعض لوگوں نے طواف شروع کر دیا تھا، اور ایک بار پھر اس مزار میں وہ شروع ہونے والا تھا جو ہمارے ہاں کے مزاروں میں ہوتا ہے، لیکن اللہ تبارک و تعالی نے حکومت وقت کو توفیق دی اور انہوں نے عوام کو اس دلدل میں دھنسنے سے پہلے ہی قبر کے دو جانب بند کر کے اسے طواف سے روک لیا، قبر تو نظر آرہی تھی، لیکن اس کے ارد گرد اونچی دیوار لگا دی گئی تھی، جس کی وجہ سے قبر کو چھونا ممکن نہ تھا اور دیوار کے پاس ایک رسی بھی لگا دی گئی تھی؛ تاکہ کوئی دیوار کو چھونے کی بدعت میں مبتلا نہ ہو۔

مزار پر حاضری کے دوران ہی مدرسہ کے تمام طلبہ اساتذہ مدرسہ کے ہال میں جمع ہو گئے تھے، اور اساتذہ نے مزار سے ہی استقبال کے لیے گروپ میں موجود علماء کرام کا ساتھ اختیار کیا اور گروپ کی معیت میں مدرسہ میں داخل ہوئے، اسی احاطے میں خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمہ اللہ کی عصا بھی رکھی ہوئی تھی، جس کے نیچے سے لوگوں نے گزرنے کی بدعت شروع کی تو حکومت نے اسے بھی ایک احاطے میں یوں بند کر دیا کہ اب اس کے نیچے سے گزرنا ممکن نہیں ہے۔

مدرسہ کے ہال میں داخل ہوئے تو طلبہ کا ایک محبت بھرے نظروں سے دیکھنے والا مجمع نظر آیا، جن کی نگاہیں نہ صرف اکابر پر ٹکی ہوئی تھیں، بلکہ گروپ میں آئے ہر فرد کو وہ چاہ و حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، جس کے قریب جو بیٹھا، اس نے اپنی نگاہیں اس کے لیے بچھا دیں اور خود کھڑے ہو کر مہمان کو بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا، اور مہمان کے بیٹھنے کے بعد خود بیٹھا، مجمع جب ہال میں بیٹھ گیا تو سب سے پہلے قاری عبدالرحمن رحیمی صاحب نے تلاوت کی، اس کے بعد مدرسہ کے ناظم اور نگران نے سپاس نامہ پیش کیا، حکومت وقت کی طرف سے بھی ان علماء کے یہاں آنے پر شکریہ ادا کیا، اور تمام اساتذہ و طلبہ کی طرف سے بھی شکریہ ادا کیا، اس کے بعد حکومت وقت اور اپنے ملک کے لیے دعا کی درخواست بھی کی، ان سب کی ترجمانی بھائی سنجار صاحب فرما رہے تھے۔

سپاس نامے کے بعد مفتی رضوان عزیز صاحب نے گروپ کی طرف سے شکریہ ادا کیا اور گروپ کا مختصر تعارف کروایا، جس کا ترجمہ بھائی سنجار کرتے رہے، اس کے بعد مولانا طاہر مسعود صاحب نے بیان کیا اور پاکستان ازبکستان کے درمیان تعلقات کے بارے میں بتلایا اور خوشی کا اظہار کیا اور وہاں کے علماء کو پاکستان آنے کی دعوت بھی دی، پھر استاد محترم حضرت مولانا محمد عبدالحلیم چشتی صاحب نے اجازت دی اور وہاں کے بعض اساتذہ کو مفتی احمد صاحب کے کہنے پر عمامہ باندھے گئے، جن میں مولانا اسماعیل صاحب بھی تھے جو وہاں کے بڑے مدرس اور بزرگ عالم دین بھی تھے انہیں بھی پگڑی پہنائی پھر مولانا عزیز الرحمن رحمانی صاحب، مولانا ارشد الحسینی صاحب، مولانا طلحہ رحمانی صاحب، مفتی رضوان عزیز صاحب، مولانا طاہر مسعود صاحب نے کچھ ہدایا تقسیم کئے، مجمع میں بعض علماء ایسے بھی تھے جنہوں نے قاری عبدالرحمن رحیمی صاحب کی تلاوت کا دوبارہ مطالبہ کیا اور قاری صاحب کو دوبارہ تلاوت کے لیے بلایا گیا، تلاوت کے دوران بعض گروپ کے ساتھی بھی

انہیں کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور قاری صاحب نے بہت خوبصورت آواز میں: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا...الآية، [فرقان:٦٣]﴾ تلاوت شروع کی اور سورت کے آخر تک تلاوت کرتے رہے، بہت ہی جھوم جھوم کر قرآن کریم کی ذکر کردہ عبادالرحمن کی صفات کا بیان کیا، اس کے بعد مجمع برخواست ہوا اور طلبہ نے استاد محترم اور دیگر اکابرین کو گھیر لیا تاکہ ان کے ساتھ ساتھ خدمت میں رہیں۔

یہاں ایک چیز جو بہت زیادہ محسوس کی کہ ان حضرات کے ہاں اکابر دیوبند کی بڑی قدر تھی، انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ اس گروپ میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے رشتہ دار موجود ہیں تو ان کے ایک استاد نے اس بات کو مجمع میں خصوصی طور پر ذکر کیا اور بار بار یہ بتاتے رہے کہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرت کشمیری کے نواسے ہمارے درمیان ہیں، جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کے نواسے بھی ہمارے ساتھ ہیں تب تو ان کی محبتیں اور الفتیں مزید بھی بڑھ گئیں۔

سید امیر کلال رحمہ اللہ کا مزار

طلبہ واساتذہ کے جھرمٹ میں ہم سب مدرسہ سے باہر نکلے اور وہاں سے نکل کر ہم بس کی طرف روانہ ہوئے اس لیے کہ ہمیں کچھ مزید جگہیں دیکھ کر تاشقند کے لیے واپس ہونا تھا، چنانچہ ہم بس میں سوار ہو کر رستے میں موجود سید امیر کلال رحمہ اللہ جو کے سلسلہ نقشبندیہ ہی کے بزرگ تھے ان کے مزار پر حاضر ہوئے۔

امیر کلال رحمہ اللہ کا اسم گرامی شمس الدین امیر کلال بن امیر حمزہ ہے، آپ صحیح النسب سید ہیں، سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور اور اکابر صوفیاء میں سے تھے۔

امیر کلال کی جائے ولادت بخارا ہے، شہر بخارا سے چھ میل کے فاصلہ پر سوخار نامی قریہ میں ٦٧٦ھ مطابق ۱۲۷۸ء میں پیدا ہوئے، آپ کی نسبت بابا سماسی سے ہے ۲۰ سال ان کی خدمت میں رہے، حضرت بابا سماسی رحمہ اللہ کے خلیفہ اور خواجہ خواجگان حضرت بہاؤالدین نقشبندی رحمہ اللہ کے شیخ تھے۔

جمعرات ۸ جمادی الاول ۷۷۱ھ بمطابق ۲۸ نومبر ۱۳۷۰ء بروز جمعرات کو اس دار فانی سے دائمی

ملک بقاروانہ ہوئے مزار مبارک سوخار میں زیارت گاہ اور مرکز رشد وہدایت ہے۔

یہاں بھی دعا وفاتحہ خوانی کرکے ہم خواجہ شمس الدین کلال، اور خواجہ محمد درویش رحمہما اللہ کے مزار پر گئے۔

پھر ایک ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے رکے، جہاں ہم نے بخاری پلاؤ کا خصوصی مطالبہ کیا تھا، کیونکہ رز بخاری اور پاکستان کی بخاری چاول بہت کھائے تھے، لیکن بخاری پلاؤ خود بخارا میں کھانے کا لطف ہی علیحدہ ہوتا، اگرچہ یہاں کے بخاری پلاؤ ہمارے کھانے کا نہیں تھا، ہمیں تو بس بخارا میں بخاری کھانے کا مزہ لینا تھا سو وہ دیکھ وچکھ لیا، ورنہ پاکستان میں کھائے ہوئے "بخاری پلاؤ" شاید بخارا کے بخاری پلاؤ سے زیادہ اچھے بنے ہوتے ہیں۔

یہاں ہمارے ساتھ وہ دو طلبہ بھی شامل تھے جو بخارا پہنچتے ہوئے ہمارے ساتھ ہوئے تھے، انہوں نے بھی اسی ہوٹل میں کھانا کھایا اور وہ بھی ساتھ رہے، ہم نے ساتھ میں ہی بنی ایک مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی، یہ مسجد سڑک پار تھی، جب ہم سڑک پر اتر آئے تو وہاں موجود پولیس اہلکاروں نے گاڑیاں رکوادیں اور ہم بسکون واطمینان مسجد چلے گئے، نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو باہر دیکھا کہ ہمارے ایک ساتھی کی طبیعت خراب تھی، اور وہ پروٹوکول میں موجود ایمبولینس میں ڈاکٹر سے دوا لینے میں مصروف تھے، بھائی سنجار بھی ساتھ تھے، ہم ان کی عیادت کے لیے پہنچے تو بھائی سنجار نے منع کیا، ہم نے بعد میں معلوم کیا تو شاید الرجی کا مسئلہ ہوگیا تھا، جس کے لیے انجکشن لگائے جارہے تھے۔

اسی ہوٹل میں ہمیں پارسل کھانا بھی دیا گیا، جو ہمارے بخارا سے تاشقند کے ٹرین کے سفر میں کھانا تھا، ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ہم نے وہاں عصر کی نماز اول وقت میں پڑھی اور پھر ٹرین میں سوار ہوگئے، ٹرین اندر سے تو عام ٹرین تھی، پاکستانی ٹرین کی طرح، لیکن اس میں صفائی کا انتظام بہت اچھا تھا، ہم سب ٹرین میں سوار ہوئے تو وہ طلبہ جو ہمارے ساتھ تھے اور بلکہ مدرسہ میر عرب میں بڑھ گئے تھے وہ بھی ہمیں رخصت کرنے آئے اور روتے ہوئے بعض طلبہ نے رخصت کیا اور بار بار ملاقات کی دعا کرتے ہوئے ہماری ٹرین روانہ ہوئی۔

ہم ایک کیبن میں چھ افراد سوار ہوئے جن میں حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب، مولانا قاری شیر محمد صاحب، مفتی حذیفہ رحمانی صاحب، مولانا یاسر عبداللہ صاحب، مفتی عمران ممتاز صاحب اور بندہ شامل

تھے، سفر کی ابتدا ہی میں استاد محترم سے ظرافت کی باتیں شروع ہوئیں، اور کافی وقت تک استاد جی کی ظریفانہ باتیں سنتے رہے، قاری شیر محمد صاحب کے لطیفے اور استاد محترم کی ظرافت میں وقت ایسا کٹا کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا۔

ہم چونکہ ابتدائی وقت ہی میں نماز پڑھ چکے تھے اس لیے عصر کا وقت تو گزرا، لیکن بعض ساتھیوں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی، انہوں نے وضو بنا کر جب نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو جگہ ندارد، پتہ چلا کہ "پبلک پلیس" پر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، اب پریشان، ایک پولیس والے نے ان ساتھی کو اسٹاف کے کیبن میں نماز پڑھنے کی اجازت دی، جب وہ نماز پڑھنے لگے تو دیگر پولیس افسران کو دیکھ کر انہوں نے اس ساتھی کو اپنی کیبن سے باہر نکلنے کے لیے کہا، اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے کیبن سے باہر نکل کر رستے میں ہی نماز پڑھنا شروع کر دی، جس کا اثر ہمارے خیال میں دو سو ڈالر جرمانہ تھا، لیکن رب کو کچھ اور ہی منظور تھا، چنانچہ پولیس والے خود کھڑے ہو کر نمازی کے آگے سے گزرنے سے منع کرتے رہے اور اس طرح سب ساتھیوں نے عصر مغرب اور عشاء کی نماز ٹرین ہی میں ادا کی۔

کچھ سفر طے کرنے کے بعد ہمیں خیال ہوا کہ کینٹین میں جا کر چائے دیکھنی چاہیئے، شاید کچھ اچھی ملے، میں اور مفتی عمران صاحب ساتھ چلتے چلتے کینٹین تک پہنچ گئے، جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ چھوٹی سی جگہ پر کیبن نما کینٹین ہے جس میں ایک آدمی بیٹھا چیزیں بیچ رہا ہے، ہم بھی وہاں چائے پینے کے لیے گئے اور چائے لے کر وہاں بنی کرسیوں پر بیٹھ گئے، لیکن اس کینٹین میں دو ہی گول اونچی ٹیبلیں تھیں مزید کچھ نہیں تھا، سو ہم نے وہاں بیٹھ کر چائے پی، لیکن ساتھ والی ٹیبل پر دیکھا تو ایک گورا بیٹھا برگر کھا رہا تھا اور ساتھ میں شراب پی رہا تھا، ہمیں دیکھ کر تعجب تو بہت ہوا لیکن جب روسی تسلط کا خیال آتا تو پھر اس عمومی عمل پر تعجب بھی خود ختم ہو جاتا تھا، کینٹین والے کو جب پیسے دینے لگے تو اس نے پوچھا مسلمان ہیں؟ ہم نے کہا: ہاں، تو اس نے پوچھا؟ آپ پاکستانی ہیں یا افغانی؟ ہم نے بتایا کہ ہم پاکستانی ہیں، تو اس نے کہا کہ پیسے چھوڑ دیں آپ ہمارے مہمان ہیں، ہم نے بھی کافی اصرار کیا اور اس کے بعد وہ پیسے لینے پر راضی ہوا، اس کی گفتگو سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اس حلیے میں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

رات کے وقت ہم تاشقند پہنچے، ہماری بس ریلوے اسٹیشن پہلے ہی پہنچ چکی تھی، ہم ٹرین سے اتر کر فورا ہوٹل کے لیے روانہ ہو گئے، چونکہ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ رات کا کھانا اسی ڈبے کے اندر ہے اسی پر اکتفا کرنا ہے سو

ہم بھی چپ چاپ ڈبہ میں موجود کھانا کھا کر ہوٹل "گولڈن ویلی" پہنچے اور اپنے کمرے چلے گئے، یہاں بھی تقسیم کمرہ میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی؛ کیونکہ جو کمرے پہلے دن اس ہوٹل میں تھے وہی کمرے آج بھی ملے سوائے چند کے جن کی ترتیب پہلے بن چکی تھی، اور دوران سفر انہوں کمروں کی ترتیب بدل دی تھی، ان کو اب یہاں اسی حساب سے خود کمروں میں تبدیلی کرلینی تھی، اس لیے یہاں کمروں کی تقسیم میں دشواری نہیں ہوئی۔

رات آرام کرنے کے بعد صبح کے وقت ہمیں آرام کرنے کا موقع زیادہ دیا گیا تھا؛ کیونکہ آج کا دن ہمیں خریداری کے لیے دیا جانا تھا اور گیارہ بجے کے بعد ہمیں قریب کے سپر مارکیٹ لے جایا جانا تھا، اور ایک جماعت (جن کا انتخاب شاید رات میں کرلیا گیا تھا اس) نے حکومتی افراد سے ملاقات کرنی تھی، جن میں مفتی رضوان عزیز، مولانا عزیز الرحمن رحمانی، مفتی طاہر مسعود، مولانا ارشد الحسینی صاحب وغیرہ حضرات شامل تھے، ان حضرات کی وزیر مذہبی امور، وزیر اعظم وغیرہ سے شاید ملاقات کروائی گئی تھی، یہ حضرات صبح ہی ملاقات کے لیے چلے گئے تھے اور گروپ کے باقی ساتھیوں نے فجر کے بعد بھی آرام کیا، اور ساتھ میں ہوٹل کے ناشتے سے بھی تفصیلی طور پر لطف اندوز ہوئے، ناشتے کے بعد سامان سمیٹنا شروع کیا، کیونکہ آج پاکستان بھی واپسی تھی، گیارہ بجے کے قریب ہم سب بس میں سوار ہونے کے لیے نیچے اترے اتنی دیر میں جو گروپ سرکاری عہدیداران سے ملاقات کے لیے گیا تھا، وہ بھی واپس پہنچ گیا، اور ہم سب بس میں سوار ہو کر خریداری کے لیے نکلے، بس ایک بڑے مال کے پاس رکی اور بھائی سنجار نے ہمیں بتایا کہ یہاں پر آپ کو دو گھنٹے خریداری کے لیے دیئے جائیں گے، سب ساتھی بس سے اتر کر مال چلے گئے، استاد محترم کے ساتھ بندہ بھی مال میں چلا گیا، لیکن "مال" اتنا خاص نہیں تھا؛ کیونکہ اس میں اس نوعیت کی چیزیں ہی مل رہی تھیں جو شاید ہمارے ملک پاکستان میں زیادہ اچھی مل سکتی تھیں، ساتھیوں کی خواہش تھی کہ اس ملک کی جو خاص ثقافتی چیزیں ہوں انہیں خریدا جائے، اس لیے اکثر ساتھی واپس بس میں آگئے، اگرچہ کچھ ساتھیوں نے یہاں سے بھی خریداری کی، چاکلیٹ وغیرہ اور دیگر کچھ چیزیں بھی لیں، لیکن اکثر ساتھیوں کی رائے وہاں سے کچھ خریدنے کی نہ تھی، چنانچہ بھائی سنجار کو کہا گیا کہ یہاں سے چلیں ہمیں کسی ایسی جگہ جانا ہے جہاں خاص چیزیں ملیں۔

لیکن بات ٹلتے ٹلتے اس حد تک پہنچ گئی کہ ہم ظہر کے قریب ایک جامع مسجد پہنچے جو بہت ہی خوبصورتی سے بنی ہوئی تھی اور تاشقند شہر کی ایک بڑی مسجد تھی، سفید رنگ میں بنی یہ مسجد بہت نفاست سے بنائی گئی تھی

اور مسجد کے ساتھ کافی وسیع احاطہ بھی تھا، جہاں فوارے وغیرہ بھی تھے اور پارکنگ بھی بہت وسیع بنائی گئی تھی، وہاں ہم نے ظہر کی نماز ادا کی اور پھر قریب کے ہوٹل میں کھانا کھانے گئے جو شاید سرکاری دعوت تھی اور مقامی ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی۔

آزادی اسکوائر میں موجود اشیاء

کھانا کھانے سے پہلے ہم تاشقند کے آزادی چوک گئے، جہاں بہت وسیع وعریض احاطے میں کئی باغ بنائے گئے، اور درختوں کا ہجوم بھی عام جگہوں سے زیادہ تھا، دور سے ایسا نظر آتا تھا کہ کسی جنگل میں داخل ہورہے ہوں، لیکن اندر صفائی کا بڑا اہتمام کیا گیا تھا، اتنے وسیع وعریض رقبہ ہونے اور درختوں کی کثرت کے باوجود رستوں پر ہمیں کہیں بھی درخت کے پتے گرے ہوئے نظر نہیں آئے، صاف رستوں پر چل چل کر ہم نے وہاں بنائی گئی مختلف یادگاریں دیکھیں، جن میں سے اکثر چیزیں حکومت وقت نے بنائی تھیں، جن میں چند یہ تھیں:

۱-شہداء ازبکستان کا یادگاری کتبہ:

ازبک قوم کی ایک جنگ ہوئی تھی، جس میں بہت سے ازبکی نوجوان اور جنگجو شہید ہوئے تھے، ازبک حکومت نے ان کی یادگار میں ایک جگہ بنائی ہے جس میں پیتل کی بہت بڑی بڑی تختیوں پر ان کا نام لکھا گیا تھا، یہ بہت بڑی تختیاں ہیں اور ان پر کندہ نام بھی واضح ہیں، اور کئی کئی صفحات ہیں تقریبا دس فٹ اونچی ان تختیوں میں سن وار شہدا کے نام لکھے گئے ہیں، اور غالبا ساتھ میں علاقے کا نام اور ان کے شہید ہونے کی تاریخ بھی درج ہے۔

۲-دوران جنگ منتظر ماں کا مجسمہ:

اسی احاطے میں ایک بڑا مجسمہ بنایا گیا جو ایک منتظر ماں کا ہے، جو گھر میں بیٹھی ہے اور اس کے سامنے گویا تنور میں آگ جل رہی ہے، یہ ماں اپنے جنگ میں گئے بچوں کا انتظار کررہی کہ بچے آئیں گے تو ان کے لیے

روٹیاں پکائے گی، اور کافی انتظار کی وجہ سے غمزدہ بھی بیٹھی ہے، اور اس کے سامنے بنے تنور میں مستقل آگ جلتی رہتی ہے، جو رات دن جلائی جاتی ہے، اس کے اندر شاید گیس کی لائن لگائی گئی ہے جو آگ جلانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

۳-زلزلہ کی یادگار:

اسی طرح ایک مجسمہ بنایا گیا ہے جس میں زلزلہ کو ظاہر کیا گیا ہے اور ایک شخص اپنے بیوی بچوں کو لے کر بچانے کی کوشش کر رہا ہے، اور اپنی گھروالی کو بھی تسلی دے رہا ہے۔

۴- آزادی گیٹ:

اسی طرح ایک گیٹ بنایا گیا ہے جو آزادی گیٹ کے نام سے مشہور ہے، اس دروازے کے اوپر ''سارس ''نامی پرندے کے مجسمے بنائے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر پرندے ہیں جو اڑ رہے ہیں اور خوشی کا اظہار بھی کر رہے ہیں، اس کے سامنے ایک بہت بڑا سا حوض بھی بنایا گیا ہے۔

اسی آزادی اسکوائر میں حکومتی اداروں کی عمارات بھی ہیں، جو مختلف کاموں میں مصروف ہیں، جن میں سے پارلیمنٹ بھی ہے اور کچھ دیگر ادارے بھی اسی آزادی اسکوائر میں ہیں، یہاں پر یہ ادارے ملکی کاموں میں مصروف ہیں۔

اس احاطے میں گھومتے ہوئے بعض ساتھیوں نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا کہ استاد محترم کو آگے آگے چلایا جائے تاکہ مجمع ایک ساتھ رہے، چنانچہ اسی پر عمل کرتے ہوئے استاد محترم کو آگے رکھا گیا، لیکن بعض جگہوں پر جب بعض ساتھی آگے ہو جاتے تو مولانا ارشد مدنی صاحب پھر سے آواز دیتے تھے، استاد محترم کو جب اس بات کا علم ہوا کہ مجمع کو پیچھے رہنے کے لیے کہا گیا ہے تو استاد محترم نے بہت تیزی سے چلنا شروع کیا، یہاں تک کہ بندہ کو تیز چلنا پڑا، اس پر بعض ساتھیوں نے بندہ سے کہا بھی کہ ذرا آہستہ چلیں استاد جی کو تکلیف ہو گی، لیکن اندر کی بات تو میں جانتا تھا کہ استاد محترم کی وجہ سے مجھے تیز چلنا پڑ رہا تھا، نہ کہ میری وجہ سے استاد

محترم کو، ان کا خیال بجا تھا کیونکہ دکھنے کے اعتبار سے میں جوان تھا اور استاد محترم ضعیف العمر تھے، لیکن حقیقت میں استاد جی چلنے میں ہم سے زیادہ طاق تھے، ہم تو موٹر سائیکلوں اور سست روی کی وجہ چلنے سے قاصر تھے، لیکن استاد محترم ماشاء اللہ اس عمر بھی پیدل چلنے کے عادی ہیں، لہٰذا انہیں چلنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔

آزادی اسکوائر سے فراغت کے بعد ہم قریبی ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے، جہاں پر حکومت کی طرف سے دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا، اور کھانے کے بعد بھائی حامد صاحب، بھائی سنجار اور دیگر منتظمین کو ہدایا پیش کئے گئے، اور بھائی حامد صاحب رسمی گفتگو کی جس میں مجمع کا بھی شکریہ ادا کیا اور ساتھ میں خدمت میں کوتاہی پر معذرت بھی کی، کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہمیں "چہار سو" بازار اور مدرسہ کوکلداش بھی جانا تھا، تاکہ وہ خریداری جس کا مطالبہ ساتھیوں نے بھائی سنجار سے کیا تھا وہ مطالبہ پورا کیا جا سکے۔

مدرسہ کوکلداش

چنانچہ ہم چہار سو بازار جانے کے لیے بس میں سوار ہوئے اور پورا مجمع یک جہت ہو کر رواں دواں تھا، ہمیں معلوم نہیں تھا کہ مدرسہ کوکلداش جو تاشقند (پرانے نام کے اعتبار سے "شاش") کا بہت پرانا مدرسہ تھا، یہ مدرسہ چہار سو بازار کے پاس ہی ہے، ہمارا خیال تو یہی تھا کہ ہم صرف چہار سو بازار جا رہے ہیں، بلکہ ذہن میں بھی یہی تھا کہ ہم بازار سے کچھ خرید کر سیدھا ایئر پورٹ جائیں گے، لیکن جب ہم اس جگہ پہنچے تو بھائی سنجار نے ہمیں مدرسہ کے بارے میں بھی بتایا تو خوشی کی انتہا نہ رہی کہ آج کے دن بھی صرف بازار نہیں جائیں گے بلکہ مدرسہ کا رخ بھی ہے۔

کوکلداش مدرسہ تاشقند کا ایک قرون وسطی کا مدرسہ ہے، جو چار سو بازار اور چار سو میٹرو اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔ یہ شیبانی سلطنت کے حکمرانوں نے ۱۵۷۰ کے آس پاس تعمیر کیا تھا۔

مدرسہ زرد اینٹوں سے بنا ہوا ہے، اور اس کا روایتی مربع شکل ہے جس میں ایک بڑا دروازہ اور اندرونی صحن ہے۔ اندرونی صحن کے آس پاس کی دیواروں میں طلباء کے رہائشی کمروں پر مشتمل ہے۔ دروازہ ۲۰ میٹر (۶۶ فٹ) اونچا اور اس کے اطراف میں دو ٹاورز ہیں۔

۱۸۳۱-۱۸۳۰ میں مدرسے کی پہلی منزل کو منہدم کر دیا گیا تھا، اور اینٹوں کو قریبی بیکار بیگی مدرسہ بنانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ بعد میں اسے بحال کر دیا گیا۔ مدرسہ کو ۱۸۶۸ میں آنے والے زلزلے سے نقصان پہنچا تھا اور اس کے بعد ۱۹۰۲-۱۹۰۳ میں اس کی تعمیر نو کی گئی تھی۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں اس کی دوبارہ تشکیل نو کی گئی اور صرف کئی مذہبی عمارتوں میں سے ایک بن گئی جو ۱۹۶۶ کے تاشقند کے زلزلے سے بچ گئی۔

۱۸ ویں صدی میں مدرسہ کو کاروان سرائے میں تبدیل کیا گیا، پھر اس نے قلعے کی حیثیت سے کام کیا۔ ۲۰ ویں صدی میں یہ ایک میوزیم تھا، پہلے الحاد کا، اور بعد میں لوک موسیقی کا۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں اس عمارت کو دوبارہ مدرسہ بنایا گیا۔ (وکی پیڈیا)۔

ہم عصر کے وقت بس کو پارکنگ میں لگانے کے بعد سڑک کے نیچے سے بنے راستے پر چلتے ہوئے پھر سے اونچی سیڑھیوں پر چڑھ گئے اور وہاں ہم نے ایک خوبصورت مسجد و مدرسہ دیکھا جو واقعی کسی باذوق معمار کی معماری کی ترجمانی کر رہا تھا۔

اولاتو ہم نے عصر کی نماز قریب کی مسجد میں پڑھی، اس مسجد میں نماز پڑھنے والے بہت سے طلبہ بھی تھے، جنہوں نے داڑھی ٹوپی والے لوگ دیکھے تو فوراان پر لپک گئے، کچھ طلبہ کسی ساتھی کے ساتھ ہوئے، تو کسی نے دوسرے فرد کو خدمت پیش کی، غرض طلبہ کا ہجوم سا تھا جو ہمارے گروپ کے ساتھ بہت جلد گھل مل گیا؛ کیونکہ کنبہ سب کا ایک ہی تھا اور وہ مدرسہ تھا۔

دو طلبہ ہمارے ساتھ ہوئے اور انہوں نے ہمیں مدرسہ کوکلداش کے بارے میں بتایا اور مدرسہ میں ہمیں لے گئے جہاں پر ہمارے ساتھی نماز سے جلد فارغ ہو کر ہم سے پہلے پہنچے تھے، اور مدرسہ سے فارغ ہو کر مدرسہ کوکلداش کی زیارت بھی کر چکے تھے، ہم جب پہنچے تو گروپ کے چند ساتھی اور مدرسہ کے اساتذہ کرام سے ملاقات ہوئی جنہوں نے استاد محترم کا بہت پر جوش استقبال کیا اور دعاؤں کی درخواست کی۔

چار سو بازار

مدرسہ کے ساتھ ہی نیچے کی طرف ایک بہت بڑا بازار ہے، یہ بازار وسطی ایشیا کا قدیم بازار ہے، اس بازار

پر ایک گنبد ہے جو بغیر کسی ستون کے بنا ہے، لکھنے والوں کے بقول اس بازار میں ازبکستان کی پوری ثقافت یکجا مل جاتی ہے، اس میں ہر طرح کی ضروریات کی چیزیں میسر ہیں، بندہ اس بازار کے زیادہ اندر تک نہ جا سکا، بلکہ اس کی ابتدا ہی سے کچھ خریداری کی، بازار میں جاتے ہوئے دو طلبہ مل گئے جو انتہائی ملنسار اور نیک سیرت معلوم ہوتے تھے، وہ میرے اور استاد جی کے ساتھ بازار کی طرف چل دیئے، ہماری دو پریشانیاں تو دور ہو گئیں:

۱- جگہوں کی معلومات ۲- یہاں کے بازار میں سودا کرنا

اس لیے کہ ہمیں نہ ان کی زبان آتی تھی، نہ یہاں کے سوداوالوں سے بھاؤ تاؤ کرنا، بھاؤ تاؤ سے شاید ہم اتنا نہ گھبراتے، لیکن گروپ کے ساتھیوں نے اور خود بھائی سنجار نے جس طرح خصوصیت کے ساتھ بھاؤ تاؤ کا ذکر کیا، اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا یہ معاملہ کوئی عام نہ تھا، بلکہ اس فن میں شاید یہ ترکوں سے بھی آگے نکلے ہوئے تھے، اس لیے سمجھانے والوں نے بھی کہہ دیا تھا کہ کم از کم ایک ثلث کم میں وہ چیز مل سکتی ہے، لیکن اس بھاؤ تاؤ کے لیے بھی جگر گردہ چاہیے جو کم از کم میرے بس کی بات نہ تھی، سو ان طلبہ کے موجودگی کو غنیمت باردہ سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ کو قبول کیا؛ کیونکہ یہ دونوں ساتھی (جن میں سے ایک کا نام اسماعیل مرغینانی اور دوسرے کا نام عبدالباسط تھا) عربی جانتے تھے اور ہماری ترجمانی ازبکی زبان میں کرتے رہے، اور ساتھ میں سودا بھی خود ہی کر لیتے تھے، بازار کی طرف جاتے ہوئے کافی اترائیاں تھیں، بڑی مشکل سے استاد محترم اس جگہ ہر قدم پر سختی جھیل کر بھی اس بار بھی عزیمت کی تاریخ دہراتے ہوئے اس بازار میں داخل ہوئے، اور ٹوپی وغیرہ خریدنے کا ارادہ کیا، پہلی دکان جہاں ہم ٹوپی خریدنے گئے وہ ایک خاتون تاجر تھی جس سے بھائی اسماعیل مرغینانی نے بات کی اور اس سے کافی کم کروا کر ہمیں دلوائی، پھر ایک جوتے والے کے پاس رکے، لیکن چہار سو بازار کا رقبہ وسیع تھا اور ہم بالکل ابتدا میں تھے، اس لیے سوچا کہ استاد محترم کو مزید زحمت دینے کے بجائے ہم استاد محترم کو مدرسہ میں بٹھا کر خریداری کے لیے آجاتے ہیں، مولانا یاسر صاحب اور مفتی عمران ممتاز صاحب بھی استاد محترم کے ساتھ رک گئے تھے، چنانچہ ہم تینوں نے یہی ارادہ کیا کہ ہم بعد میں خریداری کر لیں گے، ابھی ہم مدرسہ کے پاس پہنچے ہی تھے کہ مغرب کی اذان شروع ہو گئی اور ہم سیدھا مسجد چلے گئے اور مغرب کی نماز ادا کی اور استاد محترم سے رخصت لے بازار کی طرف چل پڑے، اب ایک ساتھی استاد محترم کے ساتھ ہو لیا اور بندہ اور عبدالباسط اور توکل ایک ساتھ ہو کر باہر نکلے تو انہوں نے بتایا کہ چہار سو

بازار مغرب میں بند ہو جاتا ہے۔

ہم ایک شاپنگ مال کی طرف دوڑے تاکہ وہاں سے کچھ خریدیں، ہماری گاڑی کے جانے کا وقت ہو چکا تھا اور ''شاپنگ مال'' دور تھا، لیکن ان ساتھیوں کے دوڑ اور ساتھ کی رفاقت میں دوری اور دوڑ کا اندازہ ہی نہ ہو سکا اور ہم نے جا کر مختلف چیزیں خریدیں اور تیزی سے اپنی بس کی طرف آئے، چلنا بھی دوڑ سے کم نہ تھا، لیکن اللہ کا احسان تھا کہ ہم بروقت اپنی منزل پر پہنچ گئے، بھائی عبد الباسط اور بھائی توکل بھی ہماری وجہ سے خوب دوڑے، اللہ پاک ان کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔

ائیر پورٹ کے لیے روانگی

بس میں بیٹھ کر اور ان ساتھیوں کو آبدیدہ چھوڑ کر ہم ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے اس لیے کہ آج رات ہمیں لاہور کے لئے روانہ ہونا تھا، سو ہم واپسی کا سفر جو پہلے ہی شروع کر چکے تھے اب اسے اختتامی مراحل تک پہنچانے والے تھے۔

ائیر پورٹ کی طرف واپسی کرتے ہوئے بھائی سنجار نے سب ساتھیوں سے معذرت کی کہ دوران سفر ایک ہفتہ ہم ساتھ رہے میری کوئی بات آپ لوگوں پر ناگوار گزری ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں، اس لیے کہ وہ ساری سختیاں اور جلدی میں نے صرف آپ لوگوں کے وقت کی حفاظت کی وجہ سے کی تھی، اور ائیر پورٹ کے پاس جب بس رکی اور ہم اترنے والے تھے تو اس نے ایک عجیب جملہ کہا اور خود بھی آبدیدہ ہوا اور رونے لگا، اور مجمع پر بھی بہت اثر انداز ہوا، سنجار نے کہا: ''پورا ہفتہ آپ ہمارے ملک میں رہے، مختلف علاقوں میں گھومے، جگہ جگہ پر آپ کے سامنے لوگ محبت کا اظہار کرتے رہے اور آپ کے پاس آتے رہے آپ سے دعاؤں کی درخواست کرتے رہے، میں یہ سب کچھ نوٹ کرتا رہا، لیکن میں نے آپ کے سامنے ظاہر نہیں کیا، میرے دل میں بھی تھا اگرچہ میں نے آپ حضرات سے کہا نہیں، لیکن میں نے آپ سے دعا کی درخواست دوران سفر نہیں کی، میں اب آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لیے، میرے گھر والوں کے لیے اور خصوصا میری والدہ کے لیے آپ دعا کریں، کیونکہ آپ کی موجودگی میں میں نے اپنے گھر میں بھی بہت برکات محسوس کی'' اور یہ

کہہ کر رونے لگا، اس کے بعد مولانا ارشد الحسینی صاحب نے ان کے لیے دعا کروائی اور پھر وہ ہم سے اور ہم ان سے رخصت ہو گئے، بھائی سنجار بھی آبدیدہ نگاہوں سے چلے گئے اور بار بار ملنے کی درخواست کی۔

ائیر پورٹ میں داخلہ

یہاں ائیر پورٹ میں داخلے میں ہم لائن میں کھڑے ہوئے جو معمول کی چیز تھی، لیکن بھائی حامد صاحب پر یہ بات بہت گراں گزر رہی تھی کہ لائن میں کیوں کھڑا کیا گیا ہے، چنانچہ وہ مختلف فون کرتے رہے تاکہ معاملہ سلجھایا جائے، ساتھیوں نے ان سے کہا بھی کہ کوئی مسئلہ نہیں یہی عام طریقہ ہے اسی کے اعتبار سے چلیں گے، لیکن انہیں یہ پسند نہیں تھا، خیر معمول کی چیکنگ وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم ائیر پورٹ کے اندر داخل ہوئے، آج شاید روسی صدر ازبکستان آئے تھے، جس کی وجہ سے وائی آئی پی لاؤنج کو عام معمول کے اعتبار سے بحال نہیں کیا گیا تھا، بلکہ زیادہ وی آئی پیز کے لیے کھولا جا رہا تھا، ہمیں بھائی حامد نے بتایا کہ آج کے دن وزیر اعظم کی طرف سے ذاتی طور پر یہ وی آئی پی لاؤنج آپ لوگوں کے لیے خالی کیا گیا ہے، اس طرح ہم وی آئی پی لاؤنج میں آبیٹھے اور جہاز کے آنے کا انتظار کرنے لگے، جب تک جہاز کا وقت ہو رہا تھا اتنی دیر میں عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، چنانچہ ہم نے عشاء کی نماز ائیر پورٹ ہی میں پڑھ لی اور پھر انتظار کر رہے تھے۔

اب اپنے ملک کی طرف واپسی تھی، جو یقینا جنت نظیر ہے، دین داری اور دینی علوم میں دنیا میں بہت ساری جگہوں سے بہت آگے اور معیاری ہے، جہاں کی دینی تعلیم عالم اسلام میں ایک معتبر اور معتمد تعلیم شمار کی جاتی ہے، ہمیں آج اپنے ایسے ملک کی طرف جانا تھا جہاں دین داری کی کثرت ایسی ہے جہاں پر ایک ایک محلہ میں کئی کئی مساجد ہوتی ہیں، ہر جگہ اذان کی آوازیں گونجتی اور قال اللہ قال الرسول کی صدائیں سننے والے ایک ایک مدرسہ میں سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اور ایک ایسے ملک سے جا رہے تھے جہاں سے علم دین ایسے ختم ہو گیا کہ اب علم دین سے تعلق رکھنے والے صرف وہی لوگ ہیں جو زیر زمین رہ کر دین کی خدمت کرنے والے تھے، اور اب آزادی کے بعد کچھ موقع میسر ہوا تو افراد نہ دارد، اس لیے ان کے ہاں دین سے تعلق رکھنے والے ادنی فرد کی بھی قدر و منزلت زیادہ تھی، یہاں تک کہ ان کی موجودہ حکومت بھی علماء اور اہل علم سے محبت

کرنے اور قدر کرنے والی ہے، انہوں نے علماء کے اس وفد کے بارے میں خصوصی دلچسپی دکھائی اور جگہ جگہ پر خوب عزت افزائی کی۔

علماء کا وفد اور پاکستان ایمبیسی کا کردار:

ایک طرف تو حکومت وقت کی طرف سے معاملہ یہ کیا جارہا تھا کہ ملک بھر میں جس صوبے (ولایت) میں پہنچتے وہاں کے سرکردہ حضرات خود استقبال کے لیے پہنچتے تھے، پروٹوکول کے لیے مستقل ترتیب بنارکھی تھی، تو دوسری طرف ہمارے اپنی ایمبیسی کا حال یہ تھا کہ پورے ہفتے غلطی سے بھی اس مجمع سے ملنے تک نہیں آئے، اس گروپ میں موجود علماء کو ان جیسے ایمبیسٹروں سے کوئی خاص شغف بھی نہ تھا اور نہ ان کے آنے سے ان علماء کی عزت میں کچھ اضافہ ہوتا، اور نہ ہی ان کے نہ آنے سے علماء کی توہین و تحقیر ہوئی، بس اتنا ضرور ہوا کہ پاکستانی سفیر کی اپنے ملکی باشندوں سے معاملہ کا اندازہ ہوا، جہاں اتنے پروٹوکول کے باوجود ملاقات کو گوارا تک نہ کیا جب پروٹوکول نہ ہو اور عام پاکستانی بچارے چلے جائیں تو ان کے ساتھ کیا معاملہ برتا جائے گا، اللہ تبارک وتعالی ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔

لاہور ائیرپورٹ پر منظر

جہاز وقت پر پہنچا اور ہم ازبک ائیر لائن سے روانہ ہو کر لاہور پہنچے، ائیر پورٹ پر علماء کا سن کر بہت بڑا مجمع جمع ہو چکا تھا، بہت سارے لوگ استقبال کے لیے آئے تھے، بعض تو نہ صرف خود آئے تھے، بلکہ اپنے بچوں سمیت ائیر پورٹ رات کے اس پہر میں پہنچے ہوئے تھے۔

گروپ کے ساتھیوں نے ایک دوسرے سے معذرتیں بھی کیں، اور دعاؤں کی درخواست بھی اور ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے خوب گرمجوشی سے ملے اور بار بار ملتے رہنے کی درخواست کی۔

سب ہی ساتھی ایک دوسرے سے خوب مل رہے تھے، لیکن بعض حضرات نے تو بنا ملے ملنے سے ہی انکار کر دیا تھا، ہر ایک کے پاس گئے بھی اور ملے بھی، ہر ایک کے جانے کی ترتیب بھی پوچھی اور جب سب سے

مل لیے اور سب کی ترتیبیں معلوم کرلیں تب جاکر وہ روانہ ہوئے، ایسے لوگ بھی بہت کم ملا کرتے ہیں، اللہ ایسے لوگوں کی کثرت فرمائیں۔

ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی برادر عزیز مولانا عرفان اجمل، مولانا ذیشان صدیق صاحب اور لاہور کے رہائشی ہمارے دوست مولانا زید صاحب پہنچ چکے تھے، اور ایئر پورٹ کے باہر منتظر تھے، ہم جیسے ہی ان حضرات سے ملاقات کرکے فارغ ہوئے گاڑیوں میں بیٹھ کر مولانا زید کے ساتھ ان کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے؛ کیونکہ وہ پہلے ہی سے اپنے والد صاحب کی طرف سے اور اپنے طور پر بھی کافی اصرار کرکے استاد محترم کو اپنے ہاں لے جانے کے لیے مولانا عرفان صاحب کو راضی کرچکے تھے، چنانچہ ہم مردہ بدست زندہ ان کے ساتھ ہو لیے اور رات انہیں کے ہاں مدرسہ میں گزاری۔

اور ان کے اصرار کی وجہ سے ہم اپنے مخلص دوست مولانا عابد صاحب کو رات کے وقت آنے سے منع کرچکے تھے، اور ان سے جمعہ کی صبح ملنے کا وعدہ کرچکے تھے، مولانا عابد صاحب اس پر راضی ہوگئے تھے، غرض یہ بھی تھی کہ جب بھائی کو زحمت دی جاسکتی ہے تو پھر مولانا عابد صاحب کو اتنی رات گئے تکلیف دینا مناسب نہیں، اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے وہ اس بات پر راضی ہوگئے اور ہم مولانا زید صاحب کی طرف چل دیئے۔

رات مولانا زید صاحب کے ہاں گزارنے کے بعد صبح فجر کے بعد بھی آرام کیا، کیونکہ رات پہنچتے پہنچتے تین بج چکے تھے اور ہمیں براستہ سڑک واپسی کا سفر کرنا تھا، سو آرام کرنے کے بعد ہم نے صبح کا ناشتہ کیا اور خانقاہ سید احمد شہید میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا، شاہ صاحب کے قبر پر حاضری دی اور اس کے بعد کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔

اس کے بعد بھی کراچی تک کا سفر استاد محترم کا ہمارے لیے قابل تقلید و باعث عزم تھا، لیکن اسے فی الحال یہاں قلم بند کرنا مقصود نہیں تھا اس لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اللہ تعالی استاد محترم کے ساتھ کیے ہوئے اس سفر کو قبول فرمائے اور ہماری اس مختصر سی رفاقت کو قیامت کے دن ان حضرات کی رفاقت کا ذریعہ بنائے۔

تصاویر

مقبرہ امام ابو بکر قفال شاشیؒ(۳۶۵ھ)	مقبرہ امام محمد بن عیسی الترمذیؒ(۲۷۹ھ)

مقبرہ حضرت سید خواجہ شمس الدین امیر کلالؒ(۷۷۲ھ)	مدرسہ الغ بیگ سمرقند ریگستان اسکوائر

مقبرہ امام ابو منصور ماتریدیؒ (۳۳۳ھ)	یادگار حضرت دانیال علیہ السلام

مقبرہ خواجہ محمود انجیر فغنویؒ (۷۱۷ھ)	امام بخاریؒ کمپلیکس

مسجد کلاں (بخارا)

مقبرہ خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ (۷۹۱ھ)

آزادی اسکوائر

مدرسہ کوکلداش (تاشقند)